منٹو ۔ غالب کا پرستار

مرتب: پرویز انجم

منٹو۔ غالب کا پرستار

مرتب: پرویز انجم

منٹو — غالب کا پرستار

مرتب:

پرویز انجم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق بہ حق ادارہ محفوظ ©

اشاعت : 2012ء

کتاب : منٹو۔غالب کا پرستار

شاعر : پرویز انجم

ناشر : محمد عابد

تزئین : عبدالحفیظ

قیمت : 300 روپے

مطبع : B.P.H پرنٹر، لاہور

Manto, Ghalib ka Parastar

by

Pervaiz Anjum

Edition - 2012

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد
Cell: 0300-7980300
E-mail:misalkitabghar@gmail.com

ایک صلیب دو عہد---

غالب اور منٹو کے لیے

فہرست

منٹو کے غالب نوادرات	ڈاکٹر طارق ہاشمی	۹
منٹو، غالب کا پرستار	پرویز انجم	۱۳

حصہ اوّل

آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی	سعادت حسن منٹو	۴۶
غالب اور چودھویں	سعادت حسن منٹو	۵۳
غالب، چودھویں اور حشمت خان	سعادت حسن منٹو	۶۰
غالب اور سرکاری ملازمت	سعادت حسن منٹو	۷۱
قرض کی پیتے تھے۔۔۔	سعادت حسن منٹو	۷۷
مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت	سعادت حسن منٹو	۸۲

حصہ دوم

منٹو کی تحریر کردہ فلم "مرزا غالب"	پرویز انجم	۹۱
اسکرپٹ فلم مرزا غالب		۱۰۷
□ کتابیات		۱۸۹

منٹو کے غالب نوادرات

غالب نے کہا تھا۔

؎ کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

مگر ہوا یہ ہے کہ غالب کی کہانی نہ صرف یہ کہ سنی گئی بلکہ مختلف اسالیب میں سنائی بھی گئی۔ اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں غالب واحد ایسا فنکار ہے جو مختلف فنونِ لطیفہ کے لیے ایک پُرکشش موضوع رہا ہے۔ خصوصاً ڈرامے اور فلم کے میدان میں اُس کی شخصیت اور شاعری کو کہانی رنگ میں پیش کرنے کا رجحان بہت ہی مرغوب رہا ہے۔ غالب کے حوالے سے ڈراموں میں کچھ خواب، کچھ اصل اور کچھ طرزِ ادا کے ذریعے غالب کی شخصیت اور شاعری کو Fictionized کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں منٹو کی تحریر کردہ فلم ''مرزا غالب'' جس کا چربہ پاکستان میں بھی بنا، علاوہ ازیں خواجہ معین الدین کا سٹیج ڈرامہ ''غالب بندر روڈ پر'' مرتضیٰ حسین بلگرای کا ''مکالمۂ غالب''، محمد عبداللطیف خاں کا ''پیکرِ غالب''، اظہر افسر کا ''غالب چچا'' اور ایسے دیگر ریڈیائی ڈرامے، سٹیج تماثیل اور ٹیلی پلے وغیرہ اور گلزار کی طویل سیریل، ٹی وی پلے ''اسد اللہ غالب'' ایسے حوالے ہیں جن میں غالب فنِ اداکاری کا موضوع اِس طور سے بنا کہ اب ان شاہکاروں کی حیثیت کلاسیکی ہے۔

غالب اُردو کے افسانوی ادب اور فنِ اداکاری کا موضوع کیوں بنا؟ اِس سوال کا جواب کئی ایک پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے لیکن دیکھا جائے تو خود غالب کے فن میں افسانوی عناصر کئی ایک

رنگ سے عکس پذیر ہوئے ہیں۔ میری مراد مکاتیب غالب کا وہ نثری پیرایہ نہیں جس میں اُس نے مراسلے کو مکالمہ بنانے کی بات کی یا بعض خطوں میں باقاعدہ مکالمے تحریر کرتے ہوئے افسانوی یا ڈرامائی فضا تشکیل دی بلکہ غالب کی غزل ہی میں اسلوب شعر کے ایسے دلچسپ قرینے نظر آتے ہیں جن میں مختصر افسانے کے بعض عناصر موجود ہیں۔

دیوانِ غالب کا پہلا شعر ہی دیکھ لیجیے:

ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ ایک مکمل افسانہ ہے جس میں پلاٹ کردار اور منظر سب موجود ہیں۔ اسی طرح یہ شعر:

ع میں نے کہا کہ بزمِ ناز، چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے، مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

ع گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ع نے مژدۂ وصال ، نہ نظارہ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

اِن شعروں سے غالب کو افسانہ نگار ثابت کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ اُس کے اسلوبِ شعر میں افسانہ طرازی کا ایک تخلیقی امکان بھی موجود ہے اور منٹو ایسے عظیم افسانہ نگار کا غالب کو موضوع بنانے کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تخلیقی سطح پر منٹو نے یہ محسوس کیا کہ وہ اگر کسی شاعر کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا سکتا ہے تو وہ غالب کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

منٹو نے اپنے متعدد مضامین میں اگرچہ غالب کے کئی شعروں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ تاہم وہ تحریریں جن میں غالب ایک مکمل موضوع کی صورت میں سامنے آتا ہے وہ اِس کتاب میں یک جا کر دی گئی ہیں۔

مذکورہ تحریروں میں سے چند ایک کتابوں میں دستیاب تو تھیں لیکن نایاب بھی تھیں اور ان نوادرات کو منظرِ عام پر لا کر پرویز انجم نے یقیناً منٹو شناسی کے سلسلے کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔ وہ اِن کی جمع

دو ترتیب اور تحقیق کے جاں گسل عمل ہی سے نہیں گزرے بلکہ ان تحریروں کی جانچ پرکھ کر کے انھوں نے ان کی اہمیت کو بھی مختلف حوالوں سے اجاگر کیا ہے۔ "منٹو غالب کا پرستار" کے مندرجات سے ان کی محنت، ان کے ذوق اور ان کی صلاحیت کا نہ صرف اندازہ مکمل طور پر ہوتا ہے بلکہ ان کا قائل بھی ہونا پڑتا ہے۔ بلاشبہ اُردو ادب میں یہ بہت اہم اضافہ ہیں۔ پرویز انجم کے اپنے تحریر کردہ دونوں مضامین میں جس ادبی فہم و فراست اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مضمون "منٹو غالب کا پرستار" بہت گہرے مطالعے کے بعد لکھا گیا ہے۔ یہ معرکے کا مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی توجہ کا حامل بڑا دلچسپ اور اہم مضمون ہے۔ یہ جب کراچی کے مجلّے "اجراء" میں شائع ہوا تو اسے بہت سراہا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے لفظوں میں "پرویز انجم نے مقالہ لکھنے کا حق ادا کر دیا۔" اس مضمون میں غالب اور منٹو کے مابین شخصی، سماجی، سیاسی اور ادبی سطح پر کون کون سی اقدار مشترک تھیں، اس سلسلے میں مصنف نے کئی ایک حوالے تلاش کیے ہیں۔ اُن کا یہ بیان ملاحظہ ہو، جو تنقیدی ژرف اور تحقیقی ظرف کا عمدہ ثبوت ہے۔

> "منٹو اور غالب رند بلانوش تھے۔ دونوں میں اور قدریں بھی مشترک تھیں۔ دونوں نوجوانی میں پتنگ باز تھے۔ غالب اور منٹو کو قمار بازی کی عادت بھی رہی۔ دونوں اپنے اپنے وقت کی حکومتوں کے عتاب سے بھی برسرِ پیکار رہے۔ غالب نے پنشن اور جوئے کے مقدمات میں خواری اٹھائی اور منٹو نے فحش نگاری کے سلسلے میں کئی بار عدالتی کٹہروں کا سامنا کیا۔ اس طرح دونوں عدالتی تجربوں سے گزرے۔ غالب کو تو رسوائی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور کسی سے سامنا کرنے کی سکت نہ رہی، مگر منٹو کو اس بدنامی نے پَر پرواز عطا کر دیے اور اُن کے افسانوں کی شہرت ساتوں افلاک پار کر گئی۔ دونوں کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے ردّیوں میں بھی کافی حد تک مماثلت تھی۔ دونوں کے گھریلو حالات مخدوش رہے۔"

میرا خیال ہے کہ ایک خوبصورت کتاب اپنے مصنف کے بارے میں ہمارے جذبۂ تجسس کو اُبھارتی ہے اور ہمیں اُس کی ذات، اس کے مشاغل اور مختلف چیزوں پر اس کے خیالات سے آگاہی کی جستجو پر مجبور کرتی ہے۔ پرویز انجم بیک وقت افسانہ نگار، مضمون نگار اور محقق کے طور پر معروف ہیں۔ وہ افسانے کی طرف راغب ہوئے تو اُس میں بھی کامیاب رہے اور گزشتہ برسوں سے

مختلف رسائل و جرائد میں اُن کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (خاص طور سے وہ منٹو کے حوالے سے ایک عرصہ سے کام کر رہے ہیں۔ منٹو صدی کے سلسلے میں موصوف کی چند اور کتابیں بھی طباعت کے مراحل میں ہیں۔) جس لگن اور ولولے کے ساتھ وہ ادب کی یہ خدمت کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس تصنیف کے مندرجات کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ ادبی قارئین، محققین، ناقدین اور ادبا اور شعراء میں یکساں مقبول ہوگی۔ مجھے اُمید ہے اِس کتاب کو بھرپور پذیرائی ملے گی اور اِسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کتاب کا حصہ اوّل منٹو کی غالب کے حوالے سے چھ تحریروں پر مشتمل ہے اور حصہ دوم منٹو کی فلم ''مرزا غالب'' کے اسکرپٹ سے مزین ہے جو کہ اب تحریری شکل میں ایک ادبی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مرتب کی اس کاوش کو یقیناً تحسین کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ جواہراتِ منٹو حصہ اوّل کے مضامین اور ڈرامے، غالب پر سعادت حسن منٹو کی یہ تحریریں کچھ افسانوی اور کچھ نیم افسانوی ہیں اور ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن کی اہمیت کیا ہے، اِس پر اُردو تحقیق و تنقید کے میدان میں بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلاشبہ پرویز انجم کی یہ کتاب اپنے اندر اہم تحقیقی مواد رکھتی ہے۔ تاہم پرویز انجم نے منٹو کے غالب نوادرات کے اس زرّیں ذخیرہ کو دریافت کر کے منٹو شناسوں کے سامنے بعض سوالات ضرور رکھے ہیں اور یقیناً یہ ایک فرض بھی تھا جو انھوں نے بہ اسلوب احسن نبھایا ہے اور یہ ایک قرض بھی تھا جو پرویز انجم نے وقت، محنت اور نقد کے بہت سے دام دان کر کے چکایا ہے۔ بقول غالب:

؎ کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

ڈاکٹر طارق ہاشمی
شعبۂ اُردو
جی۔سی یونیورسٹی، فیصل آباد

منٹو — غالب کا پرستار

غالب نے کہا تھا کہ داستان طرازی منجملہ فنونِ سخن ہے۔ غالب کے شارح نظم طباطبائی کے نزدیک شاعری کی معراج یہ ہے کہ افسانہ بن جائے۔ ہمارے اُردو افسانہ میں سعادت حسن منٹو کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو نے ادب کی شاہراہ پر افسانوں کے جو سنگِ میل نصب کیے ہیں، ڈاکٹر اعجاز حسین ایم اے (ڈی لٹ) کے الفاظ میں "اُن کی شوخیِ تحریر سے ایک دنیا نقش فریادی ہے۔ ان کے کرداروں کا پیرہن کاغذی نہیں بلکہ گوشت پوست کا ہے۔" اس منفرد افسانہ نگار کے فن پر تجزیہ نگاروں اور نقادوں کے مقالہ جات میں کثرت سے اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ منٹو مغربی ادب سے متاثر تھے، خصوصاً روسی ادب سے۔ چونکہ منٹو نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں "ہمایوں" اور "عالمگیر" کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر مرتب کیے، علاوہ ازیں روسی اور مغربی ادب کے ترجمے کیے، اس بنیاد پر ناقدین نے فقط اسی بات پر صرفِ نظر کی ہے کہ منٹو پر گورکی، ماہم، گوگول اور ڈی ایچ لارنس کے اثرات تھے یا کسی نے اسے موپساں کہا۔ یہ درست ہے منٹو کی ابتدائی تحریروں میں ان عظیم ادیبوں کے اثرات نمایاں ہیں، مگر ان افسانہ نگاروں اور منٹو میں بنیادی فرق واردات کا ہے۔ منٹو نے ان کے نظریات وخیالات کی غلامانہ پیروی ہرگز نہیں کی، بلکہ ان سے تکنیکی بصیرت سیکھ کر اُردو ادب میں منفرد مقام حاصل کیا۔ اگر وہ انہی کا تسلسل ہوتے تو کچھ عرصہ بعد دنیا انہیں بھول جاتی۔ منٹو کا افسانہ آج بھی کھرا سِکّہ ہے۔ ادب کی عالمی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیجیے۔

سعادت حسن منٹو پر ہمارے ہندوستانی معاشرہ کے تہذیبی عناصر کے اثرات کا جائزہ لینے

کی بھی اشد ضرورت ہے۔ تجزیہ نگاروں اور نقادوں کے لیے تاحال یہ گوشے تفصیلی توجہ کے طالب ہیں۔ منٹو کے تخلیقی شعور میں مشرقی عوامل کی کارفرمائی کے تجزیے کی کبھی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی، جیسا کہ منٹو اُردو کے عظیم شاعر مرزا غالب سے بھی اثر پذیر ہوئے۔ منٹو مغربی افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر غالب کی طرف بھی توجہ رکھتے تھے۔ چند ایک قلم کاروں نے اُن کی پسند کی حد تک سرسری نشاندہی ضرور کی ہے مگر اس سلسلے میں وہ ناکافی ہے۔

اُردو کے جلیل القدر شاعر غالب اور اُردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو۔۔۔ ایک انیسویں صدی کا شاعر اور دوسرا بیسویں صدی کا افسانہ نگار، مگر مزاج کے اعتبار سے دونوں میں حیرت انگیز قسم کی مماثلت تھی۔ اختلاف!۔۔۔ احتجاج!۔۔۔ یہ وہ دو لفظ ہیں جنہوں نے غالب اور منٹو کو انفرادیت پسند، انانیت پسند، سرکش یا باغی بنایا اور یہی دو لفظ ان کے فن کی وسیع کائنات کے آسمان ہیں۔ اُردو شعری ادب میں مرزا غالب اور اُردو افسانوی ادب میں سعادت حسن منٹو کا معاملہ ایک سا ہے اور سچ ہے کہ ہر دو فکر رسا کی ایسی بلندی پر فائز ہیں کہ وہاں تک رسائی میں بندے کا سانس اُکھڑ جاتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے عہد کے ایسے تخلیقی نابغے ہیں کہ جن کے تخلیقی تجربے میں دونوں زمانے اپنے تمام تر حوالوں سمیت بیک وقت سانس لیتے ہیں۔ دونوں کی تخلیقات میں جدیدیت جلوۂ صد رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہر دو غیر معمولی ذہانت، فلسفیانہ غور و فکر، منفرد اندازِ نظر اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فنکار تھے اور زندگی کی نئی سے نئی تعبیر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی معنویت کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔

دراصل کچھ لوگ دروں بین ہوتے ہیں کچھ بیروں بین۔ غالب اور منٹو دروں بیں شخصیات تھیں مگر اپنے گمان سے نکل کر جب انہوں نے چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے دا کیا تو اُن کی خیال پرستی زندگی کی تخئیلی ترجمانی بن گئی۔ دونوں کی زندگیاں احساسِ محرومی سے عبارت ہیں مگر اس احساسِ محرومی میں بھی زندگی کی خواہش ان کے دل سے نہیں نکلتی اور ولولوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

غالب اور منٹو، ان کی شخصیتوں میں سب سے پہلے ایک توانائی اور برتری کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کو اپنے حسب نسب پر ناز تھا۔ منٹو کو بھی اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ دونوں کو بچپن میں بے فکری اور آوارہ خرامی سے سابقہ رہا۔ دونوں کی ابتدائی زندگی رنگ رلیوں میں گزری۔ مگر یہ ان کی ساری زندگی نہیں تھی۔۔۔ زندگی دونوں کو بہت عزیز تھی۔ وہ زندگی کی ایک ایک بات اور ایک ایک پہلو پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کے نزدیک زندگی مسرتوں کا نام تھی لیکن زندگی اُن کی شیدائی نہیں تھی اور پھر

زندگی کی یہ سرتیں اور دلآویزیاں بھلا کسی کا ساتھ دیتی ہیں؟ ان سے محرومی ہی ایک حقیقت ہے لیکن انسان اس حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی ان سب کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی زندگی کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے رہے لیکن زندگی ان سے دور بھاگتی گئی۔ وہ زندگی کی پیاس کو کبھی نہ بجھا سکے اور ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگیاں ختم ہو گئیں۔ اُن کی خیال آفرینی کی جاہ ثروت آخر تک باقی رہی۔ انہوں نے اس کو ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اس سلسلے میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا انہیں منہ دیکھنا پڑا۔ وہ کبھی ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ اس صورت حال نے انہیں سماجی اور معاشی حالات کی ناسازگار کیفیت کا احساس دلایا۔ اپنے اپنے زمانے کی ساری سماجی زندگی انہیں ایک کرب کے عالم میں نظر آئی جس کو دونوں نے اپنی اپنی شخصیتوں کے آئینے میں دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شخصیات اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں مگر حالات نے اس انجمن کو خلوت بھی بنا دیا تھا۔ یہ المیہ کہانی ہے لیکن اس المیے میں عظمت بھی ہے۔۔۔ اس عظمت کو اُن حسرتوں اور اُن ناکامیوں نے پیدا کیا ہے جو مرتے دم تک غالب اور منٹو کے ساتھ رہیں۔

غالب اور منٹو یہ حضرات جن تلخیوں سے دوچار رہے وہ شدید سہی لیکن ایسی انوکھی بھی نہ تھیں کہ صرف ان کی ذات سے مخصوص کہی جا سکیں۔ ہر عہد کا انسان اور فنکار کسی نہ کسی لحاظ سے پریشان ہی رہا ہے۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ اُن شاعروں ادیبوں کی تعداد تو شاید انگلیوں پر گنی جا سکتی ہو جنھیں دولت، عزت، جاہت اور ہر شے سے نوازا گیا ہو، ورنہ اکثریت کا تو منٹو اور غالب کی طرح ہی حال رہا ہے۔

ع اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو

مگر غالب اور منٹو کی شخصیتوں کی توانائی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انہوں نے غم کی چبھن محسوس تو کی، اور اسے فن میں بھی سمویا۔ یہ مسلّم ہے کہ ہر انسان اور فنکار کی زندگی میں کچھ ایسے خلا پیدا ہوتے ہیں جو کبھی پُر نہیں ہو سکتے۔ دل کے ان داغوں کو کوئی مٹانا بھی چاہے تو مٹا نہیں سکتا کیونکہ زخم دل کی لکیر پتھر کی لکیر سے زیادہ مستقل ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا حادثہ ہی ہو۔ بعض معمولی سی بات بھی گہرے گھاؤ لگا دیتی ہے کیونکہ احساس کی دنیا میں "سوچ" کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ ہر ادیب و شاعر زخم خوردہ ہوتا ہے اور یہ خلش اُن کی زندگی کو داستانِ درد بنا دیتی ہے۔ ایسی شخصیات پھر آسانی سے قابو میں نہیں آتیں۔ اس کشمکش سے جو درد و کرب انہیں حاصل ہوتا ہے جو

اندر ہی اندر خون کے آنسو ٹپکتے ہیں، اور جو روح کی فریاد بلند ہوتی ہے، وہی ان کا انعام ہے کیونکہ زندگی بالآخر ان سے صلح کر لیتی ہے۔ غالب نے اس فاتحانہ جذبہ کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہر سنگ و خشت، ہے صدف گوہر شکست
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

غالب اور منٹو کی شہرت ہمیشہ یکساں اور ہموار نہیں رہی۔ منٹو کی تخلیقات پر کبھی تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسے اور کچھ حلقوں کی جانب سے کبھی سخت تنقید ہوئی، اور غالب کے بھی اپنے بہت سے معاصرین، اور ان کے بعد کے دَور کے بہت سے شعرا اور ناقدین اُن سے ناخوش اور آزردہ رہے۔ جس کے سبب غالب اور منٹو کو شارحوں اور بال کی کھال نکالنے والے ناقدین کے برزخ سے گزرنا پڑا۔ بلاشبہ ان کے ادبی کارنامے عزت و تکریم کے مستحق ہیں۔ ان کی آوازیں زمانے کے سرد و گرم میں ڈوبی ہوئی اور بھرپور ہیں۔ جن میں کہیں رقّت یا بجز اجاتے کی کیفیت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ انہیں اپنے فن پر اعتماد ہے۔ اس لیے کہ یہ فن ان کی اپنی ریاضت و فکر کا رہین ہے۔

منٹو بھی غالب کی طرح گوناگوں خصوصیات کے انسان تھے۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین آدمی تھے۔ ان کے متعلق یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ وہ ذہنی طور پر عصرِ حاضر کے سب سے زیادہ توانا اور صحت مند ادیب تھے۔ ان کی زندگی کے اس قدر متضاد پہلو ہیں کہ ہر رُخ کی مکمل تصویر پیش کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ منٹو کے باطنی تصورات اور اندازِ نگارش کے تجزیے میں فقط اُردو افسانے کا آغاز یا اُردو ادب پر مغربی افسانے کا اثر ہی کافی نہیں۔ اُردو نثر کو غالب اور سرسیّد نے جو نئی جہتیں عطا کی تھیں، اُن کا سلسلہ منٹو تک آ پہنچتا ہے۔ منٹو اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اُردو ادب خصوصاً اُردو نثر میں علی گڑھ کی ادبی تحریک سے بھی مستفید ہوئے، اگر چہ وہ علی گڑھ چند ماہ ہی رہے، مگر اُن کی تحریروں میں روشن خیالی اسی تعلق کی مرہونِ منت تھی۔ سعادت حسن منٹو اپنی بصیرت میں مشرقی نثر نگاروں کے تکنیکی اسرار و رموز پر بھی خاص توجہ رکھتے تھے۔ وارث علوی لکھتے ہیں

''آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی'' (مضمون) میں راجہ بلوان سنگھ کے ساتھ پتنگ بازی کے واقعات میں، پتنگ بازی کی اصطلاحات کا منٹو نے بالکل اسی طرح استعمال کیا، جس طرح ڈپٹی نذیر احمد ناولوں میں محاورات کا کیا کرتے تھے۔''

(''سعادت حسن منٹو —— ہندوستانی ادب کے معمار'' ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷)

یہ دلچسپ امر ہے کہ غالب کی شاعری کی چار دانگ شہرت مسلّمہ اور منٹو کو شعر و شاعری سے

کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ وہ اقرار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں۔۔۔۔میں یہ چند سطور بطور دیباچہ کے کبھی نہ لکھتا اگر میرا جی مرحوم سے مجھے عقیدت اور اس طویل نظم کے موضوع سے مجھے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ لیکن مجھے ضرور یہ اعتراف کرنا ہے کہ میں پوری طرح حق ادا نہیں کر سکا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شعر وشاعری کے بارے میں میرا علم محدود ہے۔''

(''نگارخانہ''، (مثنی مہتمم) مترجم: میراجی، امپیریل پرنٹنگ ورکس، لاہور طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ص ۷)

منٹو کو شاعری سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ اس اعتراف کے باوجود غالب کی شخصیت وشاعری منٹو کے لیے ہمیشہ جاذب رہی۔ بے شک دونوں کی ادبی سمتیں الگ الگ تھیں، لیکن غالب کی نثر میں پہلوداری، نکتہ رسی اور مزاج کی رنگارنگی سے منٹو نے بہت استفادہ کیا۔ کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کرنے کا ہنر بھی منٹو نے غالب ہی سے سیکھا اور غالب کی نگارشات نے انسانی نفسیات سمجھنے میں بھی اُن کی بہت مدد کی۔ یہ غالبیات کا ہی اعجاز ہے کہ نفسیاتی سوجھ بوجھ میں منٹو کا حریف آج تک کوئی نہیں۔ جن فکری اور فنی رفعتوں کا اعلیٰ معیار منٹو نے قائم کر دیا ہے، کوئی افسانہ نگار اس کو چھوتا نظر نہیں آتا۔ غالب اور اس کے اشعار لاشعوری طور پر منٹو کے ذہنی محرکات میں شامل ہوتے گئے اور یہ فیض غیر محسوس طریقے سے ایک عقیدت کے جذبے میں منتقل ہوتا گیا۔ منٹو غالب کے مداح تھے۔ حالانکہ علامہ اقبال سے اُن کی زمانی، مکانی ولسانی قربت تھی لیکن اقبال جس طرح کی سیاست، ثقافت اور شاعری کے داعی تھے۔ منٹو کے لیے ان میں کوئی کشش نہ تھی۔ اس کے برعکس غالب کی روشن خیالی اور آزادروی، منٹو جیسے خود پرست اور روایت شکن ادیب کو اپنی طرف مائل کرتی تھی۔ شاعری سے رغبت نہ ہونے کے باوجود منٹو غالب کے بہت بڑے پرستار تھے۔ انہیں غالب کے بے شمار اشعار ازبر تھے، جن کا استعمال وہ اپنی نثر میں نہایت فنکارانہ انداز میں کرتے تھے۔ اے حمید لکھتے ہیں:

''شعر وشاعری بظاہر اُن کی زندگی سے کوسوں دور تھی مگر غالب کے عاشق تھے۔ چنانچہ اپنے مضامین کے افسانوی مجموعوں کے نام انہوں نے غالب کے اشعار سے لیے تھے۔ مثلاً ''ناخن کا قرض'' اور ''لذتِ سنگ'' وغیرہ۔ غالب کے کسی شعر کو پڑھ کر پوچھتے، بتاؤ اس کا مطلب کیا ہے؟

لوگ اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرتے۔ منٹو صاحب زیر لب مسکراتے رہتے اور پھر ہاتھ پر زور سے ہاتھ مار کر جیسے ترپ کا پتا پھینک رہے ہوں، کہتے، ہاں! سنو اب اس کا مطلب۔۔۔''

(یادوں کے گلاب، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۸ء)

غالب ہمارے ایسے شاعر ہیں جو فقط شاعر نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے صاحب نظر، مفکر، دانشور اور نکتہ رس انسان تھے اور اس کا اعتراف سبھی نے کیا ہے اُن کی نظم ونثر میں فکر و دانش کے بے بہا موتی بکھرے پڑے ہیں، بلکہ غالب کی شاعری میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اقوالِ زریں، ضرب المثل کے طور پر تحریر و تقریر میں استعمال ہوئے۔

غالب کی ذات ہمارے اُردو ادب میں ایک دوراہا ہے۔ شاعری کی ایک روایت یہاں آ کر تکمیل حاصل کرتی ہے اور اختتام پذیر ہوتی ہے اور فکشن کی ایک روایت یہاں سے اپنا آغاز کرتی ہے۔ گویا غالب قدیم شاعری کا حرف آخر اور نئے فکشن کا حرف آغاز ہے۔ خطوط غالب کو اُردو نثر میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ نقادوں نے ان خطوط میں زبان و بیان کی بہت خوبیاں بیان کی ہیں کہ غالب نے مراسلہ نگاری میں ایک نیا ڈھنگ پیش کیا، القاب و آداب کے تکلفات ختم کیے اور بات کو سادگی سے کہنے کی رسم ڈالی یا یہ کہ اُردو نثر کو تکلف و تصنع سے پاک کیا اور سلیس نثر کی بنیاد ڈالی۔ بقول انتظار حسین ''اصل میں غالب کو جو تجربہ پریشان کر رہا تھا وہ اپنے بیان کے لیے وسعت شاعری میں نہیں، کہیں اور سے مانگ رہا تھا۔ وہ تجربہ اپنے اظہار کے لیے کسی شعری صنف کا نہیں بلکہ کسی نثری صنف کا متقاضی تھا۔ غالب کے اس تجربہ کو ہم سمجھ لیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ غالب کو اپنے بیان کے لیے جس وسعت کی تلاش تھی وہ انہیں ناول ہی میں میسر آسکتی تھی مگر ناول کی صنف اُردو میں ہنوز ایک نادر یافت علاقہ تھی۔'' ☆

غالب کو بیان کے لیے وسعت تو داستان میں بھی میسر آسکتی تھی اور انہیں داستانوں سے اچھی خاصی دلچسپی بھی تھی مگر غالب کے تجربات اور طرح کے تھے۔ غالب کے لیے وہ تہذیب ایک تجربہ بن گئی تھی جس کا آغاز آبائی شہر آگرہ اور نقطۂ عروج دِلی شہر تھا۔ وہ کچھ غالب پر ایک تخلیقی تجربے کی صورت وارد ہوا تھا۔ وہ اسے اسی طور بیان کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے عہد کی تہذیب اور معاشرت کا استعارہ بن جائے۔ غالب کو مسائل نہیں ایک تجربہ پریشان کر رہا تھا۔ اس تجربے کے بیان نے نثر کو تخلیقی نثر بنا دیا۔ منٹو کے لیے بھی اُس کا عہد اپنے رنگ و بو کے ساتھ ایک بھرپور تخلیقی تجربہ بنا۔ منٹو کی نظر بھی اپنے آبائی علاقے پنجاب اور پھر دہلی اور بمبئی کے درمیان جو انسانی سماج کی دو صدیاں آباد ہیں، اُن کے ہر ایک رُخ سے گزری تھی اور غالب کی طرح اُسی بے تکلفی سے انہوں نے اپنی نثر میں پیش کیا۔ غالب اور منٹو نے اپنی تخلیقی و تخئیلی قوتوں کے اظہار کے لیے تجربے کیے۔ ہمارے ادب میں

☆ بحوالہ ''علامتوں کا زوال''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

غالب اور منٹو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

جدید اُردو فکشن کی تاریخ خطوطِ غالب سے شروع ہوتی ہے لیکن خطوط نویسی ہمارے اُردو ادب میں کوئی با قاعدہ صنف نہیں۔ مرزا غالب نے اُردو ادب میں بالکل لاشعوری طور پر اس کی ابتداء کی تھی اگر چہ بعض دیگر مشاہیر ادب نے بھی اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس کا سہارا لیا ہے۔ لہٰذا یہ ادبی حادثہ منٹو صاحب سے بھی سرزد ہوا۔ اُن کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی شائع ہوئے ہیں۔ مگر منٹو اور غالب کے یہ خطوط کسی ادبی مقصد کے تحت نہ لکھے گئے تھے۔ تاہم ان مکاتیب کی اپنی ایک اہمیت مسلّم ہے۔ ان حضرات کی ذہانت اور طبعی جدت طرازی نے انہیں ایک ایسا حسن بخش دیا جو کبھی ماند نہیں پڑ سکتا۔ منٹو کے خطوط میں لکھنے کا انداز سیدھا سادا اور عام فہم ہے۔ دلکش طرزِ تحریر، جملوں کی بندش قابلِ ستائش اور ان میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو اُن خطوں کی ہیں جن کی بنیاد غالب نے ڈالی تھی۔ کہیں کہیں غالب کا ڈرامائی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ جیسے!

''اس وقت کرپارام صاحب کے گھر بیٹھا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے۔ پنڈت بھی سلام لکھواتے ہیں۔ وہ علیحدہ خط بھی لکھیں گے۔''

منٹو نے یہ خطوط اپنے دوست قاسمی کو لکھے ہیں۔ انہوں نے کسی ادبی مجلّے کے لیے تحریر نہیں کیے۔ اس لیے شاید اُن میں جو منٹو ہم دیکھتے ہیں وہ اُس منٹو سے مختلف ہے جو ہمیں ہتک، گوپی ناتھ، خوشیا، نیا قانون وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ افسانوں میں دوسروں کی بات ہوتی ہے لیکن خطوں میں اُن کی اپنی داستانِ حیات تھی۔ ان میں منٹو اپنی تمام تر انسانی کمزوریوں کے ساتھ اُبھرے ہیں۔ منٹو کو بمبئی شہر میں اپنی ملازمت کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے۔ مفلس منٹو کی یہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دس سال کی طویل مدت ذہنی و مالی، جسمانی و روحانی پریشانیوں کی ایک غم ناک داستان ہے۔ زمانے کے دگرگوں حالات کا شکوہ ہے۔ زمانے کی بے قدری کا، مالی خراب حالیوں کا، صحت کی خرابی کا، لوگوں کی پست ذہنیتوں کا، غالب بھی یہی کہتا ہے۔ منٹو بھی یہی کہتا ہے۔ غالب اور منٹو کے لیے زندگی ایک مستقل بیّن رہی۔ زمانہ کتنا بھی بدل جائے۔ فن کار کے لیے زندگی ہمیشہ ایک عذاب رہے گی۔ اُس کے لیے رزق کی شاید ہمیشہ کمی رہتی ہے اور غم دوراں کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

منٹو کی غالب سے انسیت کے حوالے سے پروفیسر جی ایم اثر بیان کرتے ہیں جو کشمی مینشن میں منٹو کے ہمسائے میں رہتے تھے۔ عالم آدمی تھے۔ آخری سالوں میں منٹو کے ساتھ اُن کی گاڑھی چھنتی رہی۔ ہمسائیگی کی قربت میں دونوں حضرات شغلِ نا و نوش بھی اکٹھے کرتے رہے۔ منٹو کے

آخری ایام کے ہم سبو دوست، پروفیسر غلام محی الدین اثر سے ایک پینل انٹرویو کا مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

مظفر علی سیّد: ''۔۔۔منٹو صاحب نے خود کبھی شاعری نہیں کی، شاید بچپن میں کوشش کی ہو، مگر غالب سے ان کی محبت۔۔۔؟''

جی ایم اثر: ''بے تحاشا تھی۔''

مظفر علی سیّد: ''کچھ روشنی ڈالنا پسند کیجیے گا؟''

منیر احمد شیخ: ''یہ تو اُن کی کتابوں کے عنوانات ہی سے ظاہر ہے۔''

جی ایم اثر: ''ایک دن نصیر انور کے ساتھ (منٹو) میرے گھر آئے، حالانکہ وہ عام طور پر ایسا وقت نہیں تھا جب وہ گھر سے باہر نکلتے ہوں۔ نصیر انور نے مجھ سے کہا کہ غالب کا ایک شعر ہے، یہ (منٹو) اس کے معنی پوچھتے ہیں۔ شعر ہے:

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن سے

وہ شعر میں نے دوبارہ پڑھا اور کہا کہ دوسرے مصرعے میں ''سے'' کے بعد اور ''کی'' کے بعد وقفہ دے کر پڑھیں تو معنی کھل جاتے ہیں۔ مفہوم یہ تھا کہ روزن دیوار سے کرن اندر آرہی ہے۔ محبوب کہہ رہا ہے کہ یہ تم جھانک رہے ہو۔ (منٹو) کہنے لگے، سمجھ میں آگیا، خواجہ! سمجھ میں آگیا۔''

مظفر علی سیّد: ''غالب کی طرف خاص توجہ کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ غالب پر بمبئی میں انھوں نے فلمی کہانی بھی لکھی تھی۔۔۔ ریڈیو کے لیے خاکے، ڈرامے لکھے ہوئے ہیں اور عنوانوں سے قطع نظر غالب سے انہیں کوئی گہری دلچسپی معلوم ہوتی ہے، جس کی کوئی نہ کوئی توجیہہ ہونی چاہیے؟''

جی ایم اثر: ''اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے کہ غالب ایک واقعیت شناس شاعر اور زندہ دل آدمی تھا۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ منٹو غالب کے خطوط کے ذریعے غالب کی شاعری تک پہنچا ہوگا۔ یہاں اُس کی افسانوی حس کو بھی تشفی ملی ہوگی۔ نثر نگاری کے اُسلوب نے بھی کھینچا ہوگا۔''

(انتخاب: ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' راولپنڈی، سالنامہ دسمبر ۱۹۸۳ء)

پروفیسر جی ایم اثر کا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے کہ منٹو غالب کے خطوط کے ذریعے غالب تک پہنچے، کیونکہ منٹو کو شاعری سے اتنی دلچسپی نہیں تھی اور پھر غالب کے کلام میں فارسی تراکیب نے بھی مشکل پیدا کی ہوگی۔ لہٰذا خطوطِ غالب کے مطالعہ ہی نے انہیں کلامِ غالب میں دلچسپی کی

ترغیب دی ہوگی۔ غالب کی شاعری کو سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ اسی حوالے سے نامور مصنف وصحافی حمید اختر ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''ایک دفعہ منٹو آئے ریگل سینما (لاہور کی اوپری منزل دفاتر) میں میرے کمرے میں سیدھے آئے اور کہنے لگے کہ ''غالب سب سے بڑا شاعر تھا۔ حمید اختر! اس سے بڑا شاعر اُردو میں نہیں پیدا ہوا۔ ایک شعر تم سنو، میں یہ ساری رات پڑھتا رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''جی کون سا؟'' سوچ کر کہا ''اچھا، چل یاد نہیں آرہا''۔۔۔''

(''سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد''، مرتب: شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۷)

منٹو کی تحریروں میں غالب کے اشعار کا برمحل استعمال ان کے متعدد مضامین اور خاکوں میں ملتا ہے۔ خاص طور پر وہ اپنے طنزیہ مضامین اور انشائیوں میں موضوع اور مضمون کی رعایت سے اشعار کا استعمال کرتے ہیں اور پورے مضمون میں ایک عجیب تیکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ یہ شعر ان کے مضامین کے سانچے میں اس طرح کھپ جاتے ہیں جیسے مضمون کا حصہ ہوں۔ اسی طرح منٹو کی کئی کہانیاں بھی غالب کے اشعار سے مزین ہیں اور افسانہ ''جھوٹی کہانی'' کا مرکزی کردار تو بات بات پر غالب کے پیچیدہ اور فلسفیانہ اشعار پڑھتا ہے۔ منٹو کے بچپن کے دوست اور ساتھی حسن عباس (جن کے اشتراک سے منٹو نے اپنے دوسرے ناول ''ویرا'' کا ترجمہ کیا) منٹو کی غالب سے مدح سرائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منٹو کو غالب سے گہری عقیدت تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں اس کا پرستار تھا اور اس کے مختلف عنوان مثلاً لذت سنگ، زحمت مہر درخشاں، ناخن کا قرض اور جیب کفن وغیرہ اس کے کلام سے مستعار ہیں۔ اُس نے غالب کے بیٹے کی یاد میں اپنے لڑکے کا نام عارف رکھا، لیکن وہ معصوم قیامت کو ملنے کا وعدہ کیے بغیر اس جہان فانی سے یوں اٹھ گیا جیسے اکا دکا کسی پھول سے اس کی خوشبو اُڑ جائے۔۔۔''

(مضمون: ''کچھ سعادت حسن اور کچھ منٹو کے بارے میں'' ''سیارہ ڈائجسٹ''، سالنامہ، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء)

حسن عباس کے ان الفاظ سے منٹو کی غالب سے جذباتی قسم کی عقیدت کے بارے میں بڑی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ اُنسیت غالب کی فنی عظمت کے اعتراف سے بھی آگے کی بلند یوں پر تھی۔ مزید یہ کہ مضامین کے عنوانات کا غالب کے شعروں کے انتخاب سے یہ تو بالکل عیاں ہے کہ منٹو کو غالب

سے بے حد عقیدت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ منتخب حرف و معنی اس اسلوبیاتی توانائی کی علامت بھی ہیں جس کا اظہار منٹو کے پیشِ نظر ہے۔ برطانوی حکومت کے الزامات میں عائد ہونے والے مقدمے کی تفصیل کو ایک مضمون ''لذتِ سنگ'' کے عنوان سے منٹو نے قلم بند کیا ہے۔ اس عنوان کا پس منظر غالب کا صرف ایک شعر یا ''لذتِ سنگ'' کا استعارہ نہیں، بلکہ وہ نفسیاتی محرک ہے جو منٹو کے ارادے، حوصلے اور تخلیقی رویوں کے بنیادی ضمیر کی پہچان ہے۔ ''لذتِ سنگ'' کا پیش خیمہ غالب کا یہ شعر ہے:

ع سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

غالب کے تخلیقی ذہن اور استعارے کا مفہوم منٹو کی ذات کے افسانے میں تبدیل ہو کر جس کائنات کو نمایاں کر رہا ہے۔ اس کی مثال تو غالب کے شارحین بھی پیش نہیں کر سکے ہیں۔ منٹو نے ''باندازۂ تقریر'' اور ''لذتِ سنگ'' سے جو بے مثال رابطہ تخلیق کیا ہے، اُس کو پہچان لیا جائے تو اعلیٰ شاعری کی لازوال زمانی وسعت کا اندازہ آسان ہو سکتا ہے یا یوں کہیے کہ غالب کے ایک شعر کو جینے کے لیے ادب اور شاعری اور ادب کی تاریخ کسی ایک منٹو ہی کی منتظر رہتی ہے اور محمود ہاشمی کی رائے میں تو اردو ادب میں اگر منٹو جیسے فنکار دو تین بھی ہو جاتے تو شاید غالب کا دو تہائی کلام شارحین کی ''ذہنی شطرنج'' کی بساط سے آزاد ہو کر ان فنکاروں کی تخلیقی شخصیت میں محفوظ ہو سکتا تھا، لیکن منٹو ہنوز ایک ہے اور غالب بدستور شارحین کی جیب میں کھنکتے سکوں کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔''

منٹو کی ''لذتِ سنگ'' کا قصہ آج بھی باقی ہے۔ ماہرینِ اخلاقیات، ترقی پسندوں اور منٹو کے عہد کے علما اور آج کے علما نے بھی اس پتھر کو کبھی اُن ہاتھوں میں سوچنے کی جسارت نہیں کی جو ''سوکینڈل پاور کا بلب'' کی ہیروئن کے ہاتھ میں ہے۔ منٹو کی جرأت اور جسارت کی سب سے بڑی علامت یہ پتھر ہے۔ منٹو نے اخلاقیات کے سماجی سربراہوں اور علمائے ادب کی سنگ باری کا جس جواں مردی، بے باکی اور ناقابلِ تسخیر جسارت کے ساتھ جواب دیا ہے، اُسے منٹو نے ''لذتِ سنگ'' سے تعبیر کیا ہے۔

تقسیم سے پہلے لاہور کی عدالت میں منٹو کے ایک افسانے ''بو'' سے متعلق مقدمہ کی تفصیلات بھی ''لذتِ سنگ'' میں درج ہیں۔ ''بو'' میں جس عکس کی معروضی تصویر ہے اس کا دوسرا رخ ''اوپر نیچے

اور درمیان'' میں موجود ہے۔ اس مقدمے کا فیصلہ منٹو کے حق میں ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد منٹو ''کھول دو'' پر نازل ہونے والے عتاب اور ''ٹھنڈا گوشت'' پر چلنے والے مقدمے کی تفصیل کا تذکرہ ایک دوسرے مضمون ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' میں کرتے ہیں۔ فسادات کے واقعات اور بمبئی سے پاکستان کے سفر نے اُن کے احساس میں ایسی لچک پیدا کر دی تھی کہ منٹو خود کو خارِ بیاباں پر لرزتے ہوئے شبنم کے قطرہ کی ہیئت میں محسوس کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر ایک بار پھر منٹو کا احساس اور غالب کا ذہن ایک دوسرے کے ہم عصر بن جاتے ہیں اور ایک بار پھر غالب کا ایک اور شعر منٹو کے مضمون کا پیش نامہ ثابت ہوتا ہے۔

ے لرزتا ہے مرا دِل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو خارِ بیاباں پر

یہاں ''خارِ بیاباں'' کے استعارے میں کوچہ وکیلاں اور امرتسر سے واہگہ کے راستے کی کہانیوں کا مفہوم بھی موجود ہے۔ ان سوالوں کی چبھن بھی جو ''ٹھنڈا گوشت'' کی کلونت کور کی چبھن ہے اور ٹھنڈا گوشت کے ایشر سنگھ کی بھی۔ اسی استعارے میں وہ نشتر بھی موجود ہیں جو منٹو سے ''تلخ، ترش اور شیریں''، تخلیق کراتے ہیں۔ ''خارِ بیاباں'' کے آسمان پر ''مملکتِ خداداد'' کا مہرِ درخشاں ہے اور اس کے مقابل منٹو کی انانیت، ریاکاری کے پردے فاش کرنے والی سرکشی اور احتجاج کی دمک ہے۔ قطرۂ شبنم کی صورت! ۔۔۔ کلامِ غالب سے انتخاب ''زحمتِ مہرِ درخشاں'' اس مضمون کو رقم کر کے منٹو نے اپنی سرکشی کی دستار کو، اور احتجاج کے اعتماد کو متاثر نہ ہونے دیا۔

ہندوستانی ادب کی تاریخ میں وہ دَور ایسا تھا کہ منٹو کی تخلیقات پر ہر جانب سے سخت تنقید بھی ہو رہی تھی۔ رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں نے بھی جب ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تو منٹو نے ایک اور مضمون ''جیبِ کفن'' کے نام سے لکھا، غالب کے اس شعر کے ذریعے کہ

ے فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ترقی پسندوں نے نئے ادبی معیارات قائم کر دیئے۔ ان کے نزدیک وہ ادب پارہ خوبصورت تھا جو معاشرے کو ترقی کی طرف لے کر جائے اس معیار کا نقصان یہ ہوا کہ میر، غالب اور اقبال تک کے فن پاروں کو مسترد کر دیا گیا اور منٹو ایک غیر جانبدار ادیب تھے، مگر فحش نگاری کا الزام لگا

کر انہیں رسائل میں Ban کر دیا گیا اور ان کی تخلیقات کو غیر ادبی اور فحش قرار دے دیا گیا۔ یوں تو ہر بڑے ادیب میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ کے ہاں اچھی چیزوں کے علاوہ کمزور چیزیں بھی مل جاتی ہیں، مگر تخلیق کاروں کے صحیح مرتبہ و مقام کا تعین کرنے کے لیے فنکار کی بہت اچھی چیزوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ادب اور آرٹ میں کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں، بشرطیکہ آرٹ کی متعین کردہ اقدار میں رہتے ہوئے لکھا جائے۔ بقول غالب

؎ ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

احمد ندیم قاسمی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''بعض نقادوں نے منٹو کی عریاں نگاری پر جو محنت فرمائی ہے۔ اُس سے مجھے ایک صاحب یاد آتے ہیں جو میرؔ، سوداؔ، غالبؔ و اقبالؔ کے کلام کا انتخاب قطعی منفی انداز میں کرنے چلے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان بتوں کو توڑنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کے بہت معمولی اور الجھے ہوئے حصوں کا انتخاب کیا جائے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ کلیاتِ میرؔ کا ایک تہائی حصہ خارج کر کے دو تہائی حصے پر مشتمل انتخاب شائع کر دیں تو میرؔ کو ناخدائے سخن کی بجائے گدائے سخن کہا جانے لگے۔ قریب قریب یہی عالم دوسرے اساتذہ کا ہے۔۔۔ یہ صرف منٹو ہے جو بعض نقادوں کے ''عمل معکوس'' کا شکار ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہوئے یار لوگ آغاز ہی اُس کی عریاں نگاری سے کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے علامہ اقبالؔ پر مقالہ لکھنے والا علامہ کے اس شعر سے مقالے کا آغاز کرے کہ:

؎ تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

(مضمون ''اردو افسانے میں جرأت مندی کی مثال۔۔۔ منٹو'' روزنامہ ''امروز'' لاہور ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء)

منٹو غالب کو بہت پسند کرتے تھے۔ تنقید نگار ممتاز حسین منٹو کے ایک کردار ''جیب کترا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار یونہی میں نے پوچھ لیا'' میں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سنا۔'' بولے'' جیک! میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کے پاس کوئی تعصب، کوئی چور پاکٹ نہیں ہوتا۔ اکبر الہ آبادی کی

شیروانی کے اُستر میں بائیں جانب زپ لگا ہوا چور پاکٹ تھا۔ جہاں سے اکثر ملاّ بھی بولتا رہتا۔ غالب کے فرغل میں اس قسم کا کوئی بھی چور پاکٹ نہ تھا۔''

(مضمون: ''سعادت حسن منٹو کی یاد میں'' ''نقوش''، لاہور، منٹو نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۳۲۲)

منٹو اور غالب میں کئی جہات مشترک تھیں، مگر انتظار حسین الگ رائے رکھتے ہیں۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''منٹو کا نہ غالب کے ساتھ جوڑ بیٹھتا ہے نہ اقبال سے رشتہ ملتا ہے۔ اگر اردو کے کسی شاعر سے رابطہ قائم ہوتا ہے تو وہ نظیر ہے۔۔۔۔ ان دو شاعروں کے برخلاف نظیر اور منٹو دونوں تمام خلقت کے بیچ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیتی جاگتی رنگا رنگ خلقت۔۔۔۔ لچے لفنگے، جوتی چور، ڈگڈگی بجانے والے، ریچھوں بندروں کا تماشہ دکھانے والے، کنجڑے قصائی، خوانچہ فروش، فقیر فقرا، بلبلیں اُڑانے والے، لونڈوں کو پھنسانے والے اور ہاں طوائفیں، مگر امراؤ جان ادا کے مرتبہ والی نہیں، بلکہ لکھیاریاں کسبیاں۔۔۔''

(سہ ماہی ''ادبیات'' اسلام آباد، شمارہ ۶۸، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰)

''طوائف'' منٹو کا خاص موضوع رہا ہے۔ عورت کے اس پیچیدہ کردار کی نفسیات پر منٹو نے باکمال کہانیاں لکھیں ہیں۔ ایک طوائف غالب کی بھی منظورِ نظر تھی ''چودھویں'' جس پر غالب نے رنگِ تغزل نچھاور کیا۔ منٹو نے اِس حوالے سے متعدد تحریریں لکھی ہیں اور اِس کو فلم کا موضوع بھی بنایا۔ غالب اور چودھویں بیگم کی کہانی بُننے کا خیال غالباً منٹو کو خطوطِ غالب کے مطالعہ سے آیا۔ آغا بابر لکھتے ہیں:

''بنجر زمین سے فصل بڑی محنت و مشق سے اترتی ہے اور وہ بھی صرف اس وقت جب آپ کو بنجر زمین پر اعتماد ہو۔ منٹو کو طوائف پر صرف فنّی اعتماد ہی نہ تھا، بلکہ وہ طوائف کو ایک مذہب کی طرح مانتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے لیے جس چیز نے منٹو کو سب سے زیادہ اپیل کیا تھا وہ طوائف کا کردار تھا، جسے وہ مسکرا کر ''منتی'' کہتا تھا۔''

(مضمون: ''منٹو اور طوائف''، فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۰)

منٹو اپنے ہنر میں یکتا تھے۔ کردار نگاری میں انہیں خدا داد صلاحیت حاصل تھی۔ ان کی تخلیقات کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے بہت تحقیق اور عرق ریزی کے بعد غالب پر فلمی کہانی لکھی، چنانچہ اس بارے میں وہ احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں:

''میں ''غالب'' کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ آپ شاعر ہیں، اگر آپ

یہاں ہوتے تو مجھے کتنی مدد ملتی۔ میں نے غالب کے متعلق بہت سی کتابیں جمع کر لی ہیں، اور کتابیں بھی جمع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کے پاس ایسا رسالہ ہو جس میں غالب کی زندگی کے متعلق کوئی مضمون چھپا ہو تو فوراً بھیج دیں۔"

(''منٹو کے خطوط''، کتاب نما پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۳ء)

ظاہر ہے کہ منٹو نے اس کہانی کے لیے سب ذرائع سے مواد فراہم کیا اور حقائق کی جستجو میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ غالب سے اپنی عقیدت اور احترام کے باوصف کہانی لکھتے ہوئے حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ غالب کے محاسن اور معائب دونوں کا احاطہ کیا اور روشن اور تاریک پہلوؤں کو جوں کا توں کہانی میں سمو دیا۔ کچھ ناگزیر حالات کے سبب کہانی منٹو کے پاکستان چلے جانے کے بعد فلمائی گئی۔ راجندر سنگھ بیدی نے مکالمے لکھے۔۔۔ یہ پہلی ہندی فلم تھی جسے نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔

غالب کی حیات اور طوائف موتی عرف چودھویں بیگم پر مبنی یہ فلم بہت کامیاب رہی تھی۔ غالب نے اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں اس طوائف سے اپنے عشقیہ تعلق کا ذکر کیا ہے۔ طوائف شاید زندگی کا ایسا کردار ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ منٹی یا طوائف جنس کا کاروبار کرتی ہے جس کی جستجو میں لوگ اُس کے یہاں جاتے ہیں اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں وہ لرزا خیز ساعت شاذ ہی آتی ہے۔ جسے بیان کرنے کے لیے شاعر اپنا تمام زورِ کلام خرچ کر دیتے ہیں۔ بہر کیف حضرت غالب اپنی چودھویں بیگم کے حسنِ کرشمہ ساز کے لیے غزل سرا ہیں:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

منٹو صاحب بھی ایک بار اے حمید اور شاد امرتسری کو اپنی ایک 'منٹی' سے ملانے کے لیے ہیرا منڈی لے گئے۔ وہ خوش اطوار و خوش اخلاق خاتون بازار شیخو پوریاں میں رہتی تھی۔ بڑی باذوق اور ادب دوست تھی۔ اُس کے کمرے میں شیشے کی الماریوں میں کتابیں سجی تھیں اور دیواروں پر غالب، فیض اور منٹو کی تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ قصہ مصنف اے حمید بیان کرتے ہیں:

''قریب ہی فیض احمد فیض کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ منٹو صاحب کو دیکھ کر وہ تعظیماً کھڑی ہوئی۔۔۔ ''دھن بھاگ ہمارے منٹو صاحب تشریف لائے۔''

منٹو صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اِن سے ملو۔''
خاتون نے مسکرا کر کہا ''شاد صاحب کو تو میں جانتی ہوں۔''
منٹو صاحب نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اس سے ملو، یہ رومانٹک افسانہ نگار اے حمید ہے۔ بڑا بکواسی ہے۔ تمہیں دیکھ کر بھی رومینٹک ہو جائے گا۔ اس سے خبردار رہنا۔۔۔''
خاتون نے اُسی وقت چائے پان سگریٹ منگوائے اور فیض صاحب کی غزلوں اور منٹو کے افسانوں پر باتیں کرنے لگی۔۔۔ منٹو نے کہا۔ ''تم کیا بکواس کرنے لگی ہو، کوئی غزل سناؤ۔ اچھا چلو ٹھمری سناؤ۔ چلو پھر میری غزل سناؤ۔''
خاتون نے حیرانی سے پوچھا۔ ''منٹو صاحب! آپ نے بھی کوئی غزل لکھی ہے؟''
منٹو نے شاد امرتسری سے کہا۔ ''بوتل نکالو خواجہ۔'' اور خاتون کی طرف دیکھ کر مسکرائے ''غزل لکھنی کون سی مشکل بات ہے تم پانی اور گلاس منگواؤ ابھی غزل لکھے دیتا ہوں۔'' پھر شاد امرتسری سے کہا ''خواجہ غالب کے بعد تم لوگوں کو ڈوب مرجانا چاہیے تھا۔ بڑا ''ہپ ٹلا'' شاعر تھا۔ سارے شاعروں کا دھڑن تختہ کر دیا۔''
دَور شروع ہو گیا۔ خاتون جام بھر بھر پلا رہی تھی۔ پھر اُس نے طبلے اور ہارمونیم والوں کو خاص طور پر بلایا۔۔۔ ''کون سی غزل سناؤں منٹو صاحب؟''
منٹو نے چٹکی بجا کر انگلی ہوا میں لہرائی اور کہا ''وہ غزل سناؤ غالب کی۔ کیا ہے مطلع کہ۔۔۔ ہاں۔۔۔''

نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادہ خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

خاتون نے ہاتھ باندھ کر کہا ''منٹو صاحب کوئی غریبی دعوے کی آسان سی غزل بتائیں۔ یہ دو منزلہ غزل میں کیسے گا سکتی ہوں۔۔۔''
''اچھا تم نہیں گا سکتیں تو ہم گائیں گے۔''
پھر وہ ہارمونیم اور طبلے والے کو ہدایات دینے لگے۔ یہاں سے شروع کرو۔ یوں شروع کرو۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میرے ساتھ ساتھ رہو۔ ہارمونیم والے نے تنگ آ کر پوچھا ''جی آپ کا کالا کون سا ہے؟''
منٹو صاحب نے بھنویں سکیڑ کر کہا ''جو سب سے زیادہ کالا ہے وہی میرا کالا ہے۔''
''ہاں استاد ٹھیکہ لگاؤ۔ نادھی نادھے دھنا۔۔۔''

(''یادوں کے گلاب'' مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء)

غالب منٹو کے دل کا شاعر تھا۔ منٹو کی غالب سے متعلقہ تحریریں اور کئی ایک مضامین کے عنوانات کا کلامِ غالب سے انتخاب، جگہ جگہ غالب کے شعروں کا استعمال اور پھر تصنیف ''گنجے فرشتے'' کا انتساب ''گنجِ معانی حضرت غالب کے نام'' سے بھی منٹو کی غالب کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں منٹو نے محمد حسن عسکری کے اشتراک سے مرتب کردہ ادبی رسالے میں اپنے ہم عصروں کے ایک دو لائنوں میں چند دلچسپ قلم قتلے اس طرح شائع کیے ہیں:

عزیز احمد: تصویرِ شیخ۔۔۔کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔

کنہیا لال کپور: دل ہی تو ہے نہ ''سنگ وخشت'' درد سے بھر نہ آئے کیوں۔

احمد ندیم قاسمی: نقوش لطیف، نقوش۔۔۔نقش فریادی

(دوماہی ''اُردو ادب''، مکتبہ جدید، لاہور، شمارہ ۱، ۱۹۴۹ء)

دیکھیے یہ شوخی تحریر ان ننھے منے خاکوں میں کتنی خوب صورتی سے سج گئی ہے۔ منٹو کے مرتب کردہ ''اُردو ادب'' کے فقط دو شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ یہ سلسلہ رُک گیا۔ یہ رسالہ دنیائے ادب میں آتے ہی افسانہ بن گیا، وگرنہ منٹو کا قلم جانے کتنے ایسے قتلے تراشتا جو اُردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہوتے۔

منٹو کی نظر میں غالب کا بڑا ارفع واعلیٰ مقام تھا۔ ''منٹو میرا دوست'' کے مصنف محمد اسد اللہ لکھتے ہیں:

> ''شاعری کے متعلق (منٹو) کہتے تھے، سمجھ میں نہیں آتا (لوگ) کیوں شاعری کرتے ہیں۔۔۔یار! غالب کے بعد تو کسی کو بھی شاعری کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔''
>
> (''منٹو میرا دوست''، منٹو میموریل، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۵۰)

محمد اسد اللہ نے سعادت حسن منٹو کی وفات پر ایک تاثراتی مضمون بھی لکھا۔ اس میں اپنی یادوں کو دہراتے ہوئے ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ شام کا وقت تھا۔ منٹو صاحب بار بار ڈرائنگ روم سے اٹھ کر جاتے اور ایک پیگ چڑھا آتے۔ بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ باتوں باتوں میں جینئس کا ذکر آیا تو کہنے لگے، ہمارے ملک نے تو کوئی بھی جینئس پیدا نہیں کیا۔۔۔ یہ کہتے کہتے انہیں ایک دم خیال آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سنبھل کر کہنے لگے، لیکن ہمارے ملک نے ایک جینئس کو تو ضرور پیدا کیا ہے۔ میں نے بے چینی سے پوچھا، وہ کون؟
>
> ''غالب'' منٹو نے آہستہ سے کہا۔ یہ کہہ کر اندر گئے اور ایک پیگ چڑھا آئے اور دروازے

ہی میں سے کہا:

''ہمارے ملک نے ایک اور بھی جینئس پیدا کیا ہے۔''

اب کے بار میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''وہ کون؟''

''منٹو''

اس بار منٹو نے پہلے سے آہستہ سے کہا۔''

(مضمون: ''منٹو''، ماہنامہ ''پگڈنڈی''، امرتسر، منٹو نمبر، مارچ اپریل ۱۹۵۵ء)

منٹو کے ادب میں زندگی کا عمدہ ادراک اور فلسفے کا گہرا شعور ملتا ہے۔ منٹو نے کرداروں کی سائیکی کو سمجھنے کے لیے جو کوشش کی وہ معمولی نوعیت کی نہیں تھی، غیر معمولی نوعیت کی تھی۔ کم از کم اُردو کے تخلیقی و تکنیکی ادب میں اس سے پہلے اس نہج پر کسی اور فنکار نے ایسی چابک دستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ پریم چند نے، نہ یلدرم نے، نہ علی عباس حسینی نے، نہ حیات اللہ انصاری نے اور نہ اعظم کریوی نے۔ اور پھر افسانہ نگاری قطعاً یہ نہیں کہ جو شخص افسانے کی تکنیک سے واقف ہے وہ ایک بظاہر کم حیثیت کا ہی افسانہ بنا دے۔ یہ کام ایسا سہل نہیں۔ اگر لفظوں یا تکنیک کے بل بوتے پر افسانے لکھے جاسکتے یا شعر کہے جاسکتے تو ہر نقاد شاعر اور داستان گو ہوتا، درست کہ اسلوب بیاں بہت اہم چیز ہے لیکن شعر گوئی اور افسانہ نگاری کے اصول اور قوانین سامنے رکھ کر شعر و ادب کے شاہکار تخلیق نہیں ہوتے۔ صنائع و بدائع کے ابراہیم ذوق کی طرح ''مسجد و تالاب'' تو بنائے جاسکتے ہیں، غالب کا ایک مصرع نہیں کہہ سکتے۔ وہ نظر ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی جو سپاٹ واقعات میں بھی افسانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ اُس عہد کے افسانہ نگاروں کا اپنا اپنا مقام و مرتبہ مقدم ہے اور طے ہے۔ بہر طور افسانہ طرازی ایک فنون سخن ہے۔ منٹو غیر معمولی طور پر ذہین انسان تھے نفسیات اور اُسلوب کی تشکیل میں مہارت بھی رکھتے تھے۔ جس طرح غالب الفاظ کے استعمال میں معانی کا گنجینہ اپنے تصرف میں رکھتے تھے۔ جگدیش چندر ودھاون لکھتے ہیں:

> ''منٹو بلا کا حافظہ رکھتے تھے۔ ہر دیدہ شنیدہ بات، ہر تجربہ، ہر مشاہدہ ان کے ذہن پر مرتسم ہو جاتا تھا۔۔۔ ہزاروں جزئیات ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں جمع رہتی تھیں اور بوقتِ ضرورت ان کے نوکِ قلم پر آ جاتی تھیں۔ غالب، جو اُن کا محبوب شاعر تھا، کے سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے۔''

(''منٹو نامہ''، جگدیش چندر ودھاون، مکر جی نگر، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۶۲)

منٹو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے غالب کی طرح لفظوں کا انتخاب کرتے تھے۔اپنی قوتِ متخیلہ کے رموز اور معنی کے تمام تر امکانات کو اسی طرح ملحوظِ خاطر رکھتے اور پھر وہ الفاظ مصور کے موئے قلم کا کام کرتے تھے۔ بظاہر منٹو کی تحریر بے حد سادہ ہے مگر افسانے کی ساخت، تشکیل کے اجزاء کے علاوہ اشارے کنائے، فکروں کی تکرار اور اُسلوب نگارش کی ساری خصوصیات اس میں شامل ہوتی ہیں۔اس کے باوصف منٹو نے منفرد کہانیاں لکھیں۔ لازماً، منٹو کی اوّلین ناقد ممتاز شیریں کو منٹو کے حوالے سے تنقیدی مضامین لکھتے وقت غالب کی شرح جیسی دقت پیش آئی ہو گی۔مظفر علی سیّد ممتاز شیریں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''درست ہے کہ منٹو غالب ہے نہ جیمس جوائس، جن کی شرحوں پر شرحیں لکھی جاتی ہیں، مگر منٹو کا پیغام بھی کن کن مشکلوں سے واضح ہوتا ہے اور اس کے لیے ممتاز شیریں کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، اس کا اندازہ کیا جائے تو منٹو کے ساتھ اس کے سنجیدہ ترین نقاد کو بھی خراجِ تحسین ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ جس نے ابتدا میں اشراف کی بے اعتنائی کے ساتھ منٹو کا افسانہ سُنا تو اَن سُنا کر دیا۔ بعد میں ذرا کان لگا کر سنا تو گھِن آئی، اور غور سے سننا شروع کیا تو تفہیم کے عالمی ادب اور جنسی نفسیات اور علم الاساطیر اور خدا جانے کیسے کیسے سہاروں کی سخت ضرورت پڑی۔ اور بقول یگانہ

ع سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا''

(دیباچہ: ''منٹو — نوری نہ ناری''، مرتب آصف فرخی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۰)

غالب اور منٹو بلاشبہ جینئس تخلیق کار تھے۔اُردو ادب میں دونوں کے اپنے اپنے میدان تھے۔ڈاکٹر محمد حسن نے منٹو پر ایک کتاب لکھی، جس میں انہوں نے منٹو کی تخلیقات کی روشنی میں ان کا نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔لکھتے ہیں:

''منٹو کے جینئس ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔جینئس کی تخلیقات کا سوتا اس کے لاشعور میں ہی پھوٹتا ہے۔اس کا شعور صرف انہیں الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔بقول غالب:

سے آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالب نے غیب کو جس معنی میں استعمال کیا ہے، اسے ہم لاشعور کا مترادف باور کر سکتے ہیں۔غیب کی آواز نوائے سروش بن کر فنکار کو چونکا کر دیتی ہے۔اسے قلم بند کرنے کے لیے فنکار شعوری طور پر سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔''

("سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں"، دارالاشاعت، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۰)

نوائے سروش کی توجیہہ میں محمد حسن عسکری اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"نوائے سروش بھی دوطرح سے سنی جاتی ہے۔ کبھی تو سروش اپنے آپ ہی بول پڑتا ہے۔ کبھی اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ سروش کی فیاضی سے ہر آدمی ہی ادیب بن جاتا ہے۔ لیکن سروش کو زبردستی بلوانے کے لیے ہمت درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ سروش کے کان مروڑنے کا مطلب ہے اپنے کان مروڑنا۔ آپ یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ منٹو نے سروش کے کان اس طرح مروڑے کہ وہ بولنے کی بجائے چیخ پڑا یا اول فول بکنے لگا۔ لیکن منٹو نے حوصلہ تو دکھایا۔ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ منٹو کرتا ہی کیا تھا۔ وہ بے جان باتوں کو جوڑ دیتا تھا، مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان مل بے جوڑ باتوں میں آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

ع جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار"

("ستارہ یا بادبان" مکتبہ سات رنگ، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۴)

غالب اور منٹو اپنے اپنے ادوار کے دو جینئس تھے۔ سطحی فنکار عام لوگوں کی مانند ایک مصنوعی خول سا چڑھا کر اپنی ہی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک جینئس اپنی زندگی و شخصیت پر نقاب ڈالنے کا قائل نہیں۔ سوااس کی تخلیقات وایجادات، اُس کی آئینہ داری کرتی ہیں اور عام فنکار اس سے محروم رہتے ہیں۔

یوں تو غالب اور منٹو فلاسفر نہ تھے مگر ان کی نگارشات میں فلسفہ ضرور ہے۔ انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور ضرور کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی تخلیقات میں فلسفیانہ آہنگ جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس غور وفکر کے بعد جو نتائج انہوں نے نکالے ہیں۔ ان میں غم دوراں کے احساس کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگر چہ یہ لوگ اس لحاظ سے تو فلاسفر نہ تھے کہ انہوں نے کوئی باضابطہ نظریہ مدون کیا یا کسی نظامِ فکر کی تشکیل کی، نہ ہی کسی دستاویزی اساس پر کسی مخصوص پروگرام کے مطابق ادب تخلیق کیا۔ ان کا جو بھی "تصورِ حیات" تھا وہ ان کی اپنی ہی زندگی کی Projection تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی جس رنگ سے گزری وہ اس شعر کے مصداق ہے:

ع ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بلاشبہ یہ جینئس بندے تھے۔ یہ جینئس ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے زندگی کو سمجھا اور سمجھایا۔ اپنی شخصیت کی نمائش ہی اصل میں منٹو اور غالب کے فنی محرک کی قوت تھی۔ جس کی دوسری شکل

خود پسندی اور اَنا کہہ سکتے ہیں۔

مختار صدیقی لکھتے ہیں:

''منٹو کی خود پسندی ہی ان کا فن، بلکہ ان کی شخصیت کا تار و پود تھی۔ وہ اتنے خود پسند نہ ہوتے تو سعادت حسن ضرور ہوتے، سعادت حسن منٹو ہرگز نہ بنتے۔ اسی نخوت اور اَنا نے ان سے لکھنے کے لیے ایسی محنت شاقہ کرائی کہ اچھے اچھوں کے خیال میں نہ آئی ہو گی۔ اسی خود پسندی نے ان سے اتنا لکھوا دیا اور دمِ آخر لکھواتی رہی کہ کوئی کیا لکھے گا۔ اس خود بینی نے انہیں بڑے شعور و ارادے کے ساتھ فن کی عظمت کو چھونے پر آمادہ کیا اور اپنے فن کی مسلسل تہذیب و ترقی کے لیے ایسا مزدور بنایا جسے غالب نے کوہکن کے پردے میں چھپایا۔''

ع کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب

(ماہنامہ ''افکار''، کراچی منٹو نمبر، مارچ، اپریل، ۱۹۵۵ء)

منٹو اپنی انانیت کے ہاتھوں ہفت روزہ ''مصور'' سے الگ ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت پر لات ماری۔ بمبئی کے ''فلمستان'' سے حاصل ہو رہی ہزاروں کی آمدنی چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ غالب بھی جب سفرِ کلکتہ کے دوران لکھنؤ میں ٹھہرے اور بعض احباب نے ان کی ملاقات سلطنت اودھ کے وزیر اعظم آغا میر سے کرانا چاہی لیکن یہ ملاقات اس لیے نہ ہو سکی کہ آغا میر نے غالب کی یہ شرط قبول نہیں کی کہ انہیں نقد نذرانہ پیش کرنے سے چھوٹ دی جائے اور کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کی جائے۔ عزتِ نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ غالب نے دہلی کالج میں فارسی پڑھانے کی نوکری کو اس لیے ٹھکرا دیا کہ سیکرٹری حکومتِ ہند ٹامسن صاحب سے جب گھر پر ملنے گئے تو وہ ان کے استقبال کے لیے دروازے پر نہیں آئے۔ منٹو اور غالب دونوں بہت انانیت پرست تھے، غالب شاعروں کا سرتاج اور منٹو افسانہ نویسی کا۔ اس سطح کی شخصیتوں کو نازک مزاجی، تنک مزاجی کے علاوہ ان کو اپنی عزت و توقیر کا بھی پاس رہتا ہے۔ خلاف طبع اور خلاف وضع سخن یا سلوک انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

غالب اور منٹو ـــ مشکل پسندی ان کے مزاج کا ایک غالب رُجحان رہا۔ تقلید سے یہ نفرت کرتے تھے۔ ان کا ذہن خلاق، دماغ متجسس اور دل سکون نہ آشنا تھا۔ اس لیے یہ حضرات زندگی کی ہموار سڑک کو چھوڑ کر نسبتاً مشکل راہ اختیار کرتے رہے۔ ہموار راستہ انبوہ کی رہنمائی کرتا ہے لیکن انبوہ میں فرد کی اکائی قائم نہیں رہتی اور غالب اور منٹو ایسی شخصیات جو اپنی انفرادیت کے تحفظ

کے لیے انبوہ کے ساتھ مرنا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ صاحبو! کھلے میدان کا سیدھا راستہ چھوڑ کر مڑی تڑی پگڈنڈیوں کا راستہ صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کی نگاہ تیز، اختراع کی قوت زیادہ اور انفرادیت مسلّم ہو۔ اس مشکل راہ پر چلنے کے لیے دماغ حاضر، حواس بیدار اور سوچ کو متحرک رکھنا ضروری ہو جاتا ہے اور پھر جو شخص عزمِ راسخ سے رواں دواں ہو جاتا ہے تو فطرت بھی اس پر اپنے بوقلموں خزینے کے منہ کھول دیتی ہے۔

اس Caliber کے فنکار تکبر، نخوت کے اظہار سے اپنی مہارت پر ناز بھی کرتے ہیں اور ان کی انا انہیں زود نویسی کی عادت ڈال دیتی ہے۔ اپنی اہمیت کے تحفظ کی خاطر خود پسندی کا اظہار اُن کی ضرورت بن جاتا ہے۔ یہ انا پرستی آخر تک منٹو کے ساتھ بھی رہی۔ اسی تخلیقی قسم کی ضد نے ہی منٹو سے اپنی قبر کا کتبہ لکھوایا تھا، اور غالب نے بھی اپنے کلام میں کئی جگہ اس حربے کا برتاؤ کیا ہے۔ منٹو بھی اپنی تخلیقات کے حوالے سے فنی برتری کا اظہار کرتے رہتے تھے:

> ''میں چونکہ اس میدان میں سب سے آگے ہوں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ مبتدی اور غیر مبتدی ڈراما نویس، دونوں میرے یہ اٹھارہ ڈرامے پڑھ کر مفید معلومات حاصل کریں گے۔ اور بھی اچھا ہو گا اگر یہ لوگ میرے ڈرامے ریڈیو پر بھی سنیں۔ اس سے وہ میرے محاسن اور اپنے عیوب اچھی طرح معلوم کر سکیں گے۔''

(پیش لفظ ''منٹو کے ڈرامے'')

فنکارانہ برتری کا ایسا احساس ہماری ادبی روایت کا ہمیشہ حصہ رہا ہے، بلکہ ہماری ہی کیا، یونان و روم سے لے کر فارس و فرنگ تک تمام ادبی روایات میں اپنے اپنے طریقے اور انداز کے ساتھ ایسے تصورات کی گونج سنی جا سکتی ہے اور ہمارے شعری ادب میں بھی یہ رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا جو بات منٹو نے کہی ہے کیا وہ اُس سے کچھ مختلف ہے جو ان مصرعوں میں بیان ہوئی ہے:

ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا (میرؔ)

ع کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور (غالبؔ)

یہ شاعرانہ اور فنکارانہ احساس بلاشبہ ذاتی برتری کے رویے کا مظہر ہے۔ یہ بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو اس احساس کے پس منظر میں جو اصل چیز کارفرما ہے، وہ ہے ایک ادیب شاعر کا یہ خیال کہ بحیثیت فنکار وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ انسانی زندگی کی سب سے اہم اور بامعنی سرگرمی ہے۔ یہی احساس و خیال اُس کے سنجیدہ رویے کا تعین کرتا ہے۔ اسی رویے کا تعین جو اُس کے

اندر آفاق کی سچائیوں کو جاننے، سمجھنے کی لگن اور بیان کرنے کی سکت پیدا کرتا ہے۔ یوں ہمارے سامنے زندگی کی اُس معنویت کا انکشاف ہوتا ہے جو زندگی کے روزمرہ سے ماورا ہوتی ہے۔ اِس رویے کے عقب میں دراصل زندگی کو اس کے وجودی عمل سے بلند ہو کر جاننے کی کاوش اور کچھ نہ کچھ جان لینے کی سرشاری کا احساس ہے جو غالب اور منٹو جیسے عظیم فنکاروں کے ہاں اس انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔

اپنی تخلیقات کے حوالے سے منٹو صاحب کو احساسِ برتری تو تھا، مگر اپنے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے ''منٹو کے ڈرامے'' کے پیش لفظ میں منٹو نے جس اعتماد اور قبتی برتری کا اظہار کیا ہے، ایسا دوسری اصناف میں اپنی نگارشات کے حوالے سے نہیں کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس سلسلے میں اُن کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہوا جیسا کہ غالب کی فارسی شاعری کے ساتھ ہوا۔ غالب کو بھی اپنے فارسی کلام پر بے حد ناز تھا اور اُن کا خیال تھا کہ وہی غالب کو زندہ رکھے گا۔ لیکن زمانے کا چلن بدلا اور فارسی پڑھنے اور اُس سے حظ اٹھانے والے رخصت ہو گئے اور اُردو شاعری، جسے خود غالب نے ایسی برتری کے حوالے سے نہ دیکھا تھا، وہی اُس کی بقائے دوام کا جواز ٹھہری۔ منٹو بھی اپنے ڈراموں کے بارے میں ایسی سوچ رکھتے تھے لیکن اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ وہ جن ڈراموں کو سُن کر اور پڑھ کر لوگوں کو ڈرامانویسی کا فن سیکھنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ مذاقِ زمانہ کی تبدیلی کے باعث طاق پر دھرے رہ گئے۔ اور آج چرچا ہے تو صرف اُن کے افسانوں کا۔

لیکن کلامِ غالب اور جواہراتِ منٹو کی تاثیر ابدی ہے۔ یہ حضرات اُردو ادب میں غالباً واحد ہستیاں ہیں کہ بعد از مرگ بھی جن کے منفرد اسلوب کا چرچا رہا اور ادیب حضرات نے ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اُنہی کے اندازِ نگارش میں کچھ دلچسپ تحریریں بھی سپردِ قلم کی ہیں۔ جیسے مزاح نگار شوکت تھانوی نے باعنوان ''غالبًا غالب'' کے تحت چند خطوط لکھے ہیں☆ اور غلام احمد فرقت صاحب نے بھی ''غالب کے خطوط'' کے عنوان سے ''غالب کا خط بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے نام'' ''غالب کا خط وقار عظیم کے نام'' ''غالب کا خط ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام'' ''غالب کا خط جوش ملیح آبادی کے نام'' اور ''غالب کا خط شوکت تھانوی کے نام'' وغیرہ تحریر فرمائے ہیں☆☆ اسی طرح منٹو کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کی فنی عظمت کے اعتراف کے طور پر مشاہیرِ ادب نے منٹو کے پیرائے میں بھی چند دلچسپ تحریریں لکھنے کی کاوش کی ہے۔ مثلاً ''سعادت حسن منٹو کا خط

☆ بحوالہ ''مرزا غالب اسلام آباد میں'' مرتبہ اقرار حسین شیخ، ضیائے ادب لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۶۱)

☆☆ (مطبوعہ ماہنامہ ''جائزہ'' کراچی مارچ ۱۹۶۰ء)

محمد طفیل کے نام‘‘ اور محمد خالد اختر کا ’’ چچا سام کے نام منٹو کا آخری خط‘‘ اور وسعت اللہ خان کا عالم ارواح سے لکھا ہوا منٹو کا ایک خط، علاوہ ازیں فاروق سلہریا کے چچا سام کے نام سات عدد خطوط☆ یہ سب خطوط منٹو کے انداز اسلوب سے مزین ہیں۔ محمد طفیل اور محمد خالد اختر نے تو ان خطوں میں منٹو کی غالب سے نسبت کے حوالے سے تذکرہ بھی ضروری سمجھا۔ مزاح نگار محمد خالد اختر عالم بالا سے منٹو کے انداز میں ’’چچا سام کے نام ایک خط‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’۔۔۔ چچا جان! ابھی کل کا ذکر ہے کہ حوض تسنیم کے پاس چہل قدمی کرتے ہوئے میرزا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی نہیں ہیں جنھوں نے کسی زمانہ میں دعویٰ نبوت کیا تھا (اور جن کا یہاں بسیار جستجو کے بعد بھی سراغ نہ پا سکا) یہ مرزا اور ہیں۔ مرزا اسداللہ خان غالب۔ ان کا نام بھلا آپ نے کاہے کو سنا ہوگا۔ ان کے باپ کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ سو پشت سے پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ یہ صاحب ہماری بدنصیب اُردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہو گزرے ہیں۔ آدمی مزے کے نکلے۔ فوراً بے تکلف ہوگئے۔ کہنے لگے:

اماں سعادت! یہ کیسی جنت ہے، دنیا میں تو اس کی بڑی تعریفیں سنتے تھے۔ یہاں تو دور دور تک کوئی انسان نظر پڑتا ہے، نہ کسی کو شعر کہنے سننے کا ذوق ہے۔ ہاں بھئی کسی سے کہلوا کر ایک بوتل اسکاچ کا انتظام تو کروادو۔۔۔ ’’اولڈ نام‘‘ یا کسی اور کا۔ مَتھرا داس مہاجن کے نام تمسک لکھ دیتا ہوں۔ شراب طہورہ پی پی کر ذہن و دماغ کُند ہو چکا ہے۔ اور ہاں بھئی ہماری چودھویں تو کہیں نظر نہیں پڑی؟‘‘

(’’کھویا ہوا افق‘‘ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۵)

غالب شناسوں کو تو یہ بات معلوم ہی ہے کہ شکایت، تعزیت، معذرت، مقصدیت، ظرافت اور بذلہ سنجی میں مرزا غالب کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ ایسے موقع پر ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوتے تھے۔ محمد خالد اختر نے اپنی تحریر سے انصاف کیا ہے۔ اسی طرح منٹو بھی اور پھر بیاں اپنا، ایک ذوق سخن رکھتے تھے۔ عالم بالا سے ایسی ہی ایک تحریر مدیر ’’نقوش‘‘ محمد طفیل نے بھی لکھی، جس میں انھوں نے اپنے اپنے وقت کے ان دو عظیم انا پرستوں کے تصادم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عالم بالا سے منٹو ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’۔۔۔ میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہم عصروں سے شرمندہ نہیں ہوا اس

☆مطبوعہ ہفت روزہ ’’مزدور جدوجہد‘‘ لاہور۔

لیے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا، لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھپھی باز ہے۔ کہنے لگا، تو میرا چور ہے، میرے شعروں سے تونے اپنے افسانوں کے عنوان چنے، کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر گڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی (مرزا غالب) لکھی، اس میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے، میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا، بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا، اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی، وغیرہ وغیرہ۔ (محمد طفیل!) تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو مانتا تھا، جب اس نے بھی مجھ سے ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا، لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔ لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری اَنا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔" اور میں اس سے کہتا ہوں "شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب! میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔"

بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی، لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔۔۔"

("منٹو کا ایک خط"، نقوش، لاہور، منٹو نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۳۹۵)

اَنا پرستی کی طرح رسوائی میں بھی منٹو کو غالب کی سی صورت پیش آتی رہی۔ منٹو غالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہماری زبان اُردو کا ایک شاعر ہوا ہے۔ اس نے آج سے تقریب قریب ایک صدی پہلے کہا تھا:

ے ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غریب کو زندگی میں رسوائی کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ اوّل تا آخر رسوائے زمانہ رہی۔ اس کو خوف اس بات کا تھا کہ بعد از مرگ رسوائی ہوگی۔ آدمی وضع دار تھا، اس لیے اس نے غرقِ دریا ہونے کی خواہش کی کہ جنازہ نہ اٹھے نہ مزار بنے۔"

(چچا سام کے نام ایک خط "اوپر، نیچے، درمیان")

رسوائی اور ناقدری پر کچھ اس قسم کی کیفیت کا اظہار منٹو غالب کے ایک شعر سے مستعار

باعنوان مضمون ''جیب کفن'' میں اپنے متعلق بھی کرتے ہیں:

''جب میں سوچتا ہوں اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ میں اس بے چینی کے پیشِ نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔'' (جیب کفن ''یزید'')

مگر ہوا یہ کہ منٹو کو جیسے بیسویں صدی کی ان چند دہائیوں میں ہی یونانی دیو مالائی کردار بن گئے ہیں۔۔۔ ماضی قریب کا وہ کردار جسے منٹو کہا جاتا ہے۔ اب کچھ اس طرح سب کے لیے قابلِ قبول ہے کہ جیسے وہ دیو مالا عہد میں جیا، اور تاریخ کا حصہ بن گیا۔۔۔ یونیورسٹیوں کے اساتذہ اُس پر خالصتاً علمی طرز کی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اُنہیں علامہ اقبال اور سعادت حسن منٹو میں اس کے سوا کوئی وجہ امتیاز نظر نہیں آئی کہ دونوں کا تذکرہ اُردو ادب کی تاریخ میں موجود ہے۔

لیکن زندگی میں رسوائی اور ناقدری آخر تک غالب کی طرح منٹو کے بھی ساتھ رہی۔ یہ لوگ اپنے عہد، اپنی زندگی میں سب سے افضل تصور کرنے کے باوجود آسودگی کے لمحوں سے یکسر محروم رہے۔ منٹو آخری برسوں میں اپنی حالت پر بے حد مایوس ہو گئے تھے۔ اسی طرح غالب نے بھی اپنے عہد کی بے زاری کے احساس کو اپنی تخلیقات میں خاصی جگہ دی ہے۔ اُن گئے زمانوں میں غالب زندگی بھر وقتی کے مقروض رہے، یہ الگ بات کہ اب وقتی اُن کی مقروض رہے گی۔ منٹو کا بھی شیوہ تھا دوستوں سے قرض مانگتے رہے۔ مذاق زمانہ کہ اب دوستوں کے ناخنوں پر منٹو کا قرض ہے۔

اردو ادب کے اِن عظیم ہنر مندوں کی کچھ اور جہتیں بھی ہیں۔ ممتاز کالم نگار عبدالقادر حسن، منٹو اور غالب کے حوالے سے الگ نقطۂ نظر میں، غالب اور منٹو کا تعین کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''کاش (مرزا غالب کے) اُس دَور میں آج کی طرح صحافت ہوتی اور اخبارات شائع ہوا کرتے اور مرزا کسی اخبار میں اپنے اس منفرد اور نایاب انداز میں کالم لکھا کرتے۔ اُن کے خطوط کالم نویسی کی معراج ہیں۔ اتنی شگفتہ اور بلا تکلف زبان پھر کسی نے نہ لکھی، مگر افسوس کہ جس طرح مرزا کالم نویس کی جگہ شاعر بن گئے، اسی طرح سعادت حسن منٹو بھی کالم نویس کی جگہ افسانہ نویس بن گئے۔ ایک کالم نویس سے ہم حالات زمانہ کی ناسازگاری اور صحافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے محروم رہے، دوسرے سے ہم اُس کے خاص مزاج کی وجہ سے۔ گو اُس نے لاہور کے ایک اخبار (امروز) میں کالم بھی لکھے لیکن ضرورتوں کے

باوجود اُسے ترک کر دیا۔ یہ نادرِ روزگار لوگ اپنے ہی مزاج کے لوگ تھے اور اپنی ذات پر مُصر رہتے تھے۔ اِس ضد میں انہوں نے زمانے کے دُکھ بھی اٹھائے مگر ڈٹے رہے۔

کسی نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے کہ مرزا زندگی بھر دلّی کے مقروض رہے۔ اب دلّی عمر بھر اُن کی مقروض رہے گی۔ اور یہ بالکل درست کہا ہے۔ بادشاہوں کی دلّی کسے یاد رہے گی۔ اگر رہے گی تو خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی دلّی یا مرزا غالب کی دِلّی۔ اِسی طرح منٹو کی ناداری نہیں اُس کی زندہ تحریریں باقی رہیں گی۔۔۔ منٹو کی تحریریں، جو افسانے نہیں ہیں، کالم ہیں۔ ویسے ادبی نقادوں سے گستاخی معاف منٹو کے اکثر افسانے مجھے تو کالم نظر آتے ہیں۔۔۔ وہ بلاشبہ بہت بڑے کالم نویس تھے جو بن تو افسانہ نویس گئے، مگر کالم نویسی اُن کے افسانوں میں جھلکتی رہی۔ تو جناب مرزا غالب اور سعادت حسن منٹو جو بنیادی طور پر کالم نویس تھے، اُن میں سے ایک شاعر اور دوسرا افسانہ نگار بن گیا اور ہم جیسے کالم نگاروں کو میدان خالی مل گیا۔''

(کالم: ''غیر سیاسی باتیں''، روزنامہ ''ایکسپریس''، لاہور، ۲۰ رجون ۲۰۰۹ء)

غالب اور منٹو میں کئی طرح کی مماثلت تھی۔ دونوں نے اپنے آپ کو ٹائپ نہیں بننے دیا بلکہ ان کی انفرادیت ان کے ہر ہر قدم سے نمایاں تھی اور دونوں کے تخلیقی شعور کے تجربات نے اپنی اپنی صنفوں میں ہمارے ادب کو جس طور سے مالا مال کیا ہے، ایسی کوئی مثال ہمیں ماضی میں کہیں نظر نہیں آتی۔ دونوں ہی زندگی کے کئی سینوں میں باغی تھے۔ اُن کی زندگیوں میں نقل مکانی اور آوارہ خرامی کا بھی فی الفور احساس ہوتا ہے۔ غالب کی آوارہ خرامی خود اُن کی طبیعت کی بے قراری کا شاخسانہ کہی جا سکتی ہے۔ اُن کی طبیعت فطری طور پر کسی میں سمانہیں سکتی تھی۔ اس عمل کی پہلی منزل آگرہ سے دہلی تھی اور قیامِ دہلی کے دوران میں غالب نے کلکتہ، رام پور، میرٹھ اور لکھنؤ کے سفر کیے اور ان ناکردہ گناہوں کی، یعنی سفروں کی تڑپ اُن کے دل میں آخر تک رہی۔ غالب بنیادی طور پر بہ ہمہ وقت سیّاح تھے۔ چونکہ اُس زمانے میں نہ تو سفر کی وہ سہولتیں میسر تھیں جو آجکل ہیں اور نہ ہی غالب مالی اعتبار سے اس قدر مستحکم تھے کہ اپنی حسرت آوارگی کے اہتمام کی تسکین کر سکتے۔ لہٰذا انہوں نے دو طریقوں سے اپنے اِس ذوقِ تماشا کی تلافی یوں کی، ایک تو نقل مکانی کر کے اور دوسرے اپنی شاعری میں تخیل آفرین کی مدد سے سفر کر کے۔ بقول حالی ''وہ ایک جگہ رہتے ہوئے اس سے اُکتا جاتا تھا۔'' غالب خانہ بدوشوں کی مانند عمر بھر اپنا بوریا بستر اٹھائے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے اور اپنے قیام کو سرائے کے کمرے سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ شعبان بیگ کی حویلی، کالے خان کی حویلی، حکیم محمد حسن

خان کی حویلی اور پھر آخری مسافرت گلی قاسم جان کے موڑ پر اختتام پذیر ہوئی۔
غالب جیسی بے قرار طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے منٹو بھی ہمیشہ ایک مستقل نوعیت کی آوارگی کی زد میں ہی رہے۔ اوائل عمری ہی میں گھر سے بھاگ کر لاہور اور بمبئی کے سفر کر لیے۔ اپنے گھر کے درماندہ حالات اور تلخ ماحول سے گھبرا کر پہلے چند ماہ لاہور کے ایک اخبار میں ملازمت کی، پھر مستقل بمبئی چلے گئے۔ لیکن منٹو کے نزدیک معدے کی بھوک یا آرزو کی بے ساختگی میں ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہاں کئی سال نیم ادبی فلمی رسالے ''مصور'' سے وابستہ رہے۔ فلم سے بھی منسلک رہے۔ اِس اسٹوڈیو سے نکلے اُس میں داخل ہوئے۔ کئی مرتبہ پونا یاترا کی۔ مگر طبیعت میں جولانی کے باعث چند سال بعد بوریا بستر باندھا اور دہلی نقل مکانی کر گئے۔ دو سال ریڈیو سٹیشن دتی میں بطور ڈراما رائٹر کام کرتے رہے۔ مگر حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اُن میں اک گونا آوارہ خرامی بھی تھی اسباب سے قطع نظر بلکہ یہ اندر کی بے قراری ہی کا نتیجہ تھا کہ دہلی کو بھی خیر آباد کہتے ہوئے بمبئی آ گئے اور دوبارہ فلموں سے منسلک ہو گئے۔ منٹو صاحب کی داستانِ حیات میں امرتسر سے شروع ہونے والی مسافرت بالآخر نقل مکانی پاکستان (لاہور) پر اختتام پذیر ہوئی۔
انسانی جبلت میں آوارہ خرامی، یہ ایک ایسا زور آور جذبہ ہے جس کے راستے میں کوئی بند نہیں باندھا جا سکتا۔ بقول غالب، رکتی ہے میری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور، غالب اور منٹو کی طبیعت کو ہر وہ چیز یا عمل ناگوار محسوس ہوا جس نے اُن پر کسی قسم کی بندش عائد کی یا سطحی اور روایتی ہونے کا گمان گزرا۔ لہٰذا یہ حضرات ہمیشہ سماجی اور لفظی قسم کی کھائیوں سے نالاں رہے۔
غالب اور منٹو کے ہاں ایک اور قدر مشترک اُن کا سیاسی شعور ہے۔ غالب کے خطوط میں دہلی کے غدر کی جو داستان بیان ہوئی ہے، وہ پورے ایک عہد کے اُجڑنے کی کہانی ہے۔ دہلی میں طوائف الملوکی کی، شکستِ دریخت، غالب کے قلم نے اسے لحہ لحہ کشید کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے غالب سیاسی مدوجزر ہی کے ناظر نہیں تھے بلکہ سماجی معاملات میں بھی خاصے باشعور تھے۔ اسی سے ملتے جلتے سیاسی اور فکری موسم سے منٹو بھی اپنے زمانے میں متعارف ہوئے۔ ہندوستان کے بٹوارے کے فسادات، سماجی وحشی پن اور فرقہ پرستی، اِس شکست و ریخت کے عمل میں منٹو کی حیثیت اُس کھلی آنکھ کی سی تھی جو متغیر ہونے والے مناظر کو ایک تاریخ دیکھتی چلی گئی تھی۔ اور ان مناظر کو منٹو نے اپنے افسانوں میں اور ''سیاہ حاشیے'' کے افسانچوں میں بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا سانحہ غالب کی زندگی میں

ایک بھر پور تخلیقی تجربہ تھا۔ غالب کے خطوط میں غارت زدہ شہر کی تصویر کشی بہت بھر پور نظر آتی ہے۔ غالب نے بربادو تی کو بہت ورد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس واقعہ میں نقادوں نے ان ستادوں کو غالب کی شاعری میں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس سانحہ کے ساتھ ساتھ غالب کے اندر کا شاعر گزر گیا تھا اور ایک نثر نگار پیدا ہو چکا تھا۔ غالب اور منٹو ان دونوں کی زندگیوں پر ان انسانی المیوں کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ غالب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو گئے اور منٹو ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد معاشی بدحالی کا شکار ہو کر ذہنی ابتری میں مبتلا ہو گئے۔ دونوں کی زندگیوں کے آخری سال اذیت ناک دکھ بھری اور بے تحاشہ شراب نوشی میں گزرے۔ دونوں بلا کے رند تھے۔ منٹو اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون باعنوان ''کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا'' جو کہ غالب کے ایک مصرعے سے اخذ شدہ ہے۔ اُس میں منٹو اپنی شراب نوشی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''شرابی'' اور ''شراب زدہ'' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا شراب پیتا ہے دوسرے کو شراب پیتی ہے۔ میں اس زُمرے میں آتا ہوں۔ اس لیے شراب مجھے پی رہی ہے اور جب شراب کسی انسان کو پینا شروع کر دے تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

(''سعادت حسن منٹو''، از ڈاکٹر علی ثنا بخاری، پبلشر زمنٹو اکیڈمی، لاہور، مئی ۲۰۰۶ء، ص ۲۹۳)

ایک بار ممتاز صحافی علی سفیان آفاقی نے ایک انٹرویو میں سیف الدین سیف سے سوال کیا کہ ''آپ کے خیال میں اگر منٹو شراب کے رسیا نہ ہوتے تو کیا اپنے شعبوں میں اُن کی کارکردگی بہتر ہوتی؟ یا شراب ہی اُن کی کارکردگی کا باعث تھی؟'' اس کے جواب میں سیف الدین سیف کہتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ دونوں چیزیں ہیں۔ جس طرح غالب کے بارے میں ہے کہ شراب نے اس کی شاعری کو نقصان بھی پہنچایا اور فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نشے میں کوئی چیز ضرور ہے۔ نشے میں انسان کا وجدان سے تعلق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ وجدان شاعری کی جان ہے۔ آدمی کا اپنے نیم شعوری ذہن سے رابطہ رہتا ہے اور اُس کے اندر۔۔۔ میں کئی چیزیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان نشے کی حالت میں بھی چیز لکھتا ہے لیکن سمجھتا ہے کہ میرے معیار کے قابل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اپنا بہت زیادہ لکھا ہوا کلام اس وجہ سے ضائع کر دیا۔ وہ سمجھا کہ یہ میرے معیار کے مطابق نہیں ہے اور یہ اُس غالب نے لکھا ہے جو شعور کی حالت میں نہیں تھا۔ اختر شیرانی، عدم اور منٹو کے ہاں دو چیزیں ملتی ہیں کہ ان میں بڑی بلندی بھی ہے اور پستی بھی ہے۔ ان کا لیول

ایک جیسا نہیں رہتا جس طرح کہ غالب نے اپنی پرانی اور کمزور چیزوں کو تلف کر دیا تھا۔‘‘
(’’عالی دماغ‘‘ ماہنامہ ’’سرگزشت‘‘ کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص ۵۲)

مگر اس حوالے سے منٹو اپنے مضمون ’’کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا‘‘ میں ایک اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ ’’آدمی شراب پی کر بہت اچھا شعر لکھ سکتا ہے یا افسانہ لکھ سکتا ہے، وہ بکواس کرتے ہیں۔ آدمی شراب پی کر کچھ نہیں کر سکتا۔ خصوصاً ذہنی کام تو بالکل نہیں کر سکتا۔‘‘ آدمی شراب پی کر صرف باتیں کرتا رہتا ہے۔ یہ بات ان سے زیادہ اور کون جانتا تھا منٹو اور غالب رند بلانوش تھے۔ دونوں میں اور قدریں بھی مشترک تھیں۔ دونوں نوجوانی میں پتنگ باز تھے۔ غالب اور منٹو کو قمار بازی کی عادت بھی رہی۔ دونوں اپنے اپنے وقت کی حکومتوں کے عتاب سے بھی برسرِ پیکار رہے۔ غالب نے پنشن اور جوئے کے مقدمات میں خواری اٹھائی اور منٹو نے فحش نگاری کے سلسلے میں کئی بار عدالتی کٹہروں کا سامنا کیا۔ اس طرح دونوں عدالتی تجربوں سے گزرے۔ غالب کو تو رسوائی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور کسی سے سامنا کرنے کی سکت نہ رہی، مگر منٹو کو اس بدنامی نے پَر پرواز عطا کر دیے اور اُن کے افسانوں کی شہرت سات وں افلاک پار کر گئی۔ دونوں کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے رویّوں میں بھی کافی حد تک مماثلت تھی۔ دونوں کے گھریلو حالات مخدوش رہے۔ غالب نے شاعری اور منٹو نے نثر کے موضوعات کے اعتبار سے اُردو ادب میں تجربے کیے۔ دونوں کی تخلیقی و تخیلی قوت لاجواب تھی۔ غالب کی شاعری میں انسانی احساسات اور تجربوں کی پیچیدگیاں رمز کے پردوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ اُن کے استعارے ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ملتے ہیں اور منٹو کی کہانی میں بھی انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں اور باطنی کرب کو جستہ جستہ زبان دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ غالب کے ہاں تشبیہوں اور استعاروں کی فراوانی ہے جس طرح غالب کے تجربے پیچیدہ اور متنوع ہیں، منٹو کے موضوعات بھی اُس طرح متنوع ہیں۔ منٹو نے یہ ہنر غالب سے سیکھا کہ واقعے کو براہِ راست اور اختصار کے ساتھ کس طرح لکھا جا سکتا ہے۔ یہی ذہنی اور جذباتی مماثلت ہے جو غالب کے انتقال کے تقریباً آدھ صدی بعد پیدا ہونے والے سعادت حسن منٹو کو قدم قدم پر غالب کا پرستار اور اُس کا مداح بناتی ہے۔

غالب اور منٹو اپنے اپنے زمانوں میں، اپنے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ متحرک اور بے قرار شخصیتوں کے مالک رہے۔ تخلیقی اور تخیلی حوالے سے غالب اور منٹو کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ دونوں نے اپنے اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں ہے انہوں نے نیا اضطراب پیدا کیا۔ اُن کا قلم اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتا ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں

پھیل جاتا ہے۔ غالب نے اپنے ہر تجربے کو جو ایک انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق رکھنے والے ذہن کی کارفرمائی تھی۔ کلیے کی کسوٹی پر کسا ہے اور پھر شعر کی شکل میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح منٹو نے بھی اپنے موئےسخن کو پہلے انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلایا ہے اور پیش کیا ہے تب ہی ان ہستیوں کے ہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر وادیب کا لہجہ پیدا ہوا ہے۔

رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد لکھا، جسے پبلشر نول کشور نے شائع کیا اور دھڑا دھڑ پیسہ بنایا۔ ''دیوان غالب'' غالب کے کچھ کام نہ آیا، غالب کو چھاپنے والے ادارے آج تک کمائی کر رہے ہیں۔ منٹو کی تحریریں بھی انہیں پُرتعیش زندگی نہ دے سکیں۔ منٹو تہی دست ہی رہا، اس کے بچے تنگدستی میں پلے اور بالآخر اپنے نول کشوروں ہی کے ہاتھوں مر گیا۔ اس سلسلے میں منٹو کے دیرینہ دوست ابوسعید قریشی لکھتے ہیں:

''منٹو، ہمارے سب سے بڑے افسانہ نگار کے ساتھ انہوں (پبلشروں) نے کیا کچھ نہیں کیا۔ انہی کی وجہ سے شراب نوشی اس کی عادت بنی اور وہ کینسر میں مبتلا ہو کر محققین کے لیے پی ایچ ڈی کے مواد چھوڑتا ہوا بیالیس سال کی عمر میں مر گیا۔ کلب وسکی کا زہر پانچ اور بعد میں دس روپے میں ملتا تھا۔ وہ ایک بوتل اس کے سامنے رکھ دیتے، اپنی ہی دکان کے پچھواڑے میں، اور افسانہ لکھوا کر جیب میں ڈال لیتے۔''

(''فیضانِ فیض''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ص ۱۵۶)

بیس پچیس روپے میں الہامی افسانے خریدنے والے یہ تاجر منٹو کو عسرت اور ذلت سے بچا سکتے تھے مگر وہ اسے شراب کے کینسر میں مبتلا کرتے گئے اور اس کی موت پر گِدھوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ کتابوں کے جعلی ایڈیشن دھڑا دھڑ چھپے اور رسائل کی اشاعت بڑھانے کے لیے خاص نمبر نکالے گئے اور پھر ''دوستوں دشمنوں'' نے فنی محاسن پر بحث کرتے ہوئے منٹو کو عقیدت مندی کے بوجھ تلے دفن کر دیا۔ کرشن چندر نے اس ناقدری پر لکھا ہے:

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہم نے غالب کے ساتھ یہی کیا تھا، (چراغ حسن) حسرت کے ساتھ یہی کیا تھا، پریم چند کے ساتھ یہی کیا تھا، آج منٹو کے ساتھ بھی یہی کریں گے، کیونکہ منٹو کوئی ان سے بڑا ادیب نہیں ہے، جس کے لیے ہم اپنی پانچ ہزار سال کے کلچر کی پرانی روایت کو توڑ دیں۔ ہم انسانوں کے نہیں مقبروں کے پجاری ہیں۔ آج دتی میں مرزا غالب کی پکچر چل رہی ہے۔ اس تصویر کی کہانی اسی دتی میں موری گیٹ (نکلسن روڈ، حسن بلڈنگ)

میں بیٹھ کر منٹو نے لکھی تھی۔ ایک روز ہم منٹو کی تصویر (فلم) بھی بنائیں گے اور اس سے لاکھوں روپے کمائیں گے، جس طرح آج ہم منٹو کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن ہندوستان میں چھاپ کر ہزاروں روپے کما رہے ہیں۔''

(''خالی بوتل بھرا ہوا دل'' ہفت روزہ ''آئینہ'' دہلی، ۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء)

منٹو کی موت پر حفیظ ہوشیار پوری کی تحریر میں مرحوم کے لیے بہت خلوص جھلکتا ہے۔ اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

''اب سے کوئی تین سال پہلے کی بات ہے کہ سعادت حسن منٹو کو ایک کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا، جس کا نام انہوں نے ''ناخن کا قرض'' تجویز کیا۔ اس وقت ان کے پیش نظر غالب کا یہ شعر تھا:

ے کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

اس کتاب کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جو منٹو کو اچھی طرح جانتے ہیں، اس کی شخصیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں منٹو میرے پاس بھی آئے اور کہنے لگے کہ میری شخصیت کی گرہ کشائی کا قرض میرے چند دوستوں کے ناخن پر ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے اس قرض کو جلد از جلد ادا کر دیں۔''

اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ میں کسی شعر میں منٹو کی زندگی اور موت کی ترجمانی کروں تو میں یہ شعر پڑھوں گا:

ے سکون مرگ بھی کم ہے اس آدمی کے لیے
جو زندگی میں ترستا ہو زندگی کے لیے

لیکن منٹو کی زندگی، موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ شعر ہیں:

جز دور آئینہ ندیدم اثر سعی خیال
یہ آ قدر بہر طلب گاری انسان کی رفتم
ساز ہنگامہ نہ اونر خور طاقت کر دم
راہ مستی راہ با از سامان رفتم
تاسبک روحی من رنج گرانی نکشد
شب وصلے شدم و زود بیاباں رفتم

نگہم نقب یہ گنجینۂ دلہای زد
مژدہ باد اہل ریارا کہ زمیداں رفتم

حفیظ ہوشیار پوری آگے چل کر لکھتے ہیں:

''منٹو کا قرض اب تک میرے ذمہ ہے۔ افسوس کہ میں یہ قرض اس کی زندگی میں ادا نہ کر سکا۔ اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی۔ آج میں اس قرض سے سبک دوش ہو رہا ہوں۔

ے خواند ایں مصرع تاریخ ز غالب با ''آہ''
مژدہ باد اہل ریارا کہ زمیداں رفتم

(''منٹو ایک کتاب''، مرتب: صہبا لکھنوی، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۶۴۔۴۶۶)

انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا کیا ہے؟ خوشی اور غم کی حقیقت کیا ہے؟ فنا و بقا، آرزوئے زیست اور تمنائے موت، کثافت و لطافت، روایت و بغاوت، جبر و اختیار، عبادت و ریا کاری، عشق و آلام روزگار کے مسائل، یہ ایسے امور ہیں جو ہر دور میں زندہ سوچ کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی کچھ غالب اور منٹو کے ساتھ ہوا۔ غالب کو جو دور ملا وہ انتہائی کٹھن اور شرفا کی تذلیل کے در پے تھا۔ وہ دل برداشتہ تھے۔ تنگدستی، معاشی بے اعتدالیوں اور انقلاب زمانہ نے اُن کی سوچ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اسی طرح منٹو بھی حالات کی ریشہ دوانیوں اور مالی واقتصادی بدحالیوں کا شکار رہے۔ ممتاز تنقید نگار ڈاکٹر محمد حسن، منٹو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منٹو نے اس دور میں پیدا ہوئے جب حالی، سرسید اور شبلی نعمانی پرانے دور کو بادل نخواستہ دفن کر چکے تھے اور مستقبل کو پُرامید اور پُرعمل ارادوں سے دیکھ رہے تھے، نہ غالب اور مومن کے دور میں پیدا ہوئے جب اتنا بڑا خلا اور اتنا عظیم تشنج محسوس نہ ہوا تھا۔ وہ بیسویں صدی کے ابتدائی بیس برسوں کا فرزند تھا، جس نے بہت پرانے بت گرائے اور اسی لیے اُن کے افسانوں میں بت شکن کے ہاتھوں کی سختی ہے۔ منٹو کی صلاحیت اور کہانی کے لیے اُن کے اضطراب کو قدرت نے ایک فطری زمانہ بھی ودیعت کر دیا تھا، جیسے مرزا غالب کو قدرت نے ایک ستم پرور زمانے کی سب سے بڑی حقیقت کے اوپر لا کھڑا کر دیا تھا۔''

(''شناسا چہرے''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۰)

غالب اور منٹو، یہ ایسی لازوال شخصیتیں تھیں کہ ہماری تنقید کا معیار اُن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ کسی بھی ترازو میں نہ تُل سکے۔ اصل میں فن کاروں کا قد ناپنے کا صحیح وقت وہ نہیں ہوتا جس

میں وہ زندہ ہوتے ہیں۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، سب کو چھان پھٹک کے رکھ دیتا ہے۔ بہت بڑے بڑے نام فراموش کر دیئے جاتے ہیں اور بہت سے لوگوں کی بڑائی اور ہنر کو زمانہ تسلیم کر لیتا ہے۔ غالب اور منٹو، ان فقید المثال لوگوں نے فکر و دانش کے جو موتی بکھیرے ہیں۔ اُن سب کو سمیٹنا کوئی آسان کام نہیں۔۔۔ گو بحیثیت صاحب نظر غالب اور منٹو کی قدر افزائی کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن پھر بھی اُن کی قدردانی کا پورا حق زمانے نے ابھی تک ادا نہیں کیا۔ ممتاز شیریں ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''ڈاکٹر ژواگو، میں پیاسٹرناک کا یہ قول میں نے اپنے افسانے ''میگھ ملہار'' کی توجیہ میں نقل کیا تھا کہ ''فن موت پر فتح پانے کی ایک کوشش ہے'' دنیا میں عظیم ادیبوں نے حیاتِ جاوداں پائی ہے۔ اپنی موت کے بعد بھی دو صدیوں سے زندہ ہیں، لیکن ہمارے ملک میں کتنے ادیبوں کے بارے میں اور خصوصیت سے موجودہ دَور کے کتنے ادیبوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے؟ کوئی غالب و میر ہوں، کوئی اقبال ہوں تو اور بات ہے۔ ورنہ آج منٹو کو بھی لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ اُس منٹو کو جس نے اپنا کتبہ لکھا تھا ''منوں مٹی کے نیچے دفن منٹو یہ سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟''

(مطبوعہ ''آئینہ خانہ''، ماہنامہ ''قند''، مردان، ممتاز شیریں نمبر جنوری فروری، ۱۹۷۴ء)

غالب کے کاغذی پیراہن سے لے کر منٹو کے پیراہن شرر تک انسان کے دل کی آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر بار بار سامنے آئی ہے لیکن جو چیز ''پیراہن شرر'' کو طرۂ امتیاز بخشتی ہے وہ یہ کہ منٹو کے اس پیراہن شرر کے نیچے کہیں ایک پیراہن شبنم بھی ہے۔ اِس سلگتی ہوئی دنیا کو یہ پیراہن شبنم ابھی میسر نہیں ہوا لیکن ایک سچے فنکار کا حوصلہ اِس خیال سے پست نہیں ہوتا۔ یہ تادم آخر زندگی سے نبرد آزما رہا ہے۔ منٹو صاحب کی بھی خطر پسند طبیعت کو بھی وہ مقام بجا ہی نہیں جس کی گھات میں صیّاد نہ بیٹھا ہو۔ اپنی فنی زندگی میں منٹو نے بے پروائی سے باکمال تیر اندازی کی، جس کے سبب وہ بدنام ہوا۔ لیکن اس کے باطن میں آخر تک بچے کی معصوم ضد قائم رہی۔ جس طرح عظیم فنکاروں کی جگہیں کسی بھی دَور کے عظیم سے عظیم فنکار کے وجود سے پُر نہ ہو سکیں، اسی طرح یہ منزلیں بھی ہمیشہ خالی رہیں گی۔ بلاشبہ منٹو بھی اپنے فن کا میر تھا، غالب تھا۔

ع ہائے کیا لوگ تھے وہ اگلے زمانے والے

ooo

آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

کشمیری والے کٹڑے میں ایک چھت پر مرزا اسد اللہ خان (غالب) اور اس سے کچھ دور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ پتنگ بازی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

اسد اللہ خاں ہوا کا رُخ دیکھتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے کہتا ہے کہ "یوسف! ذرا وہ لال جمدھر بڑھانا۔ اس مانگ پاٹی پتنگ کی چلت پھرت اچھی رہے گی۔ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ ٹھڈے چھلے ہوئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پتنگ کو ماہرانہ انداز سے دیکھا "بڑا ہی زوردار پتنگ ہے۔" بنسی دھر سے مخاطب ہو کر کہا "وہ دوبلی نخ والی چرخی، جو چھوٹی تپائی پر دَھری ہے، لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔"

بنسی دھر نے پتنگ لیا اور مرزا یوسف سے چرخی اٹھا کر کہا "لیکن بھائی جان! اس نخ کا مانجھا تو بہت کھردرا ہے۔" اور ڈور پر ہاتھ پھیرنے لگا "یہ تو ڈھیل پر آرانے کی نخ ہے۔"

اسد نے ذرا بھنا کر کہا "بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں۔ کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں۔ میں نے خود اسی خیال سے ماجھا کھردرار کھوالیا ہے۔"

مرزا صاحب بڑے بھائی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

ادھر دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ سے اس کا دوست شمشیر سنگھ کہہ رہا تھا "کنے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجیے گا۔"

بلوان سنگھ نے آسمان میں اُڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا "تمھیں باندھ لو۔ لیکن دیکھو دوہرے کنے ہوں۔" پھر شمشیر سنگھ کی طرف دیکھ کرتا کیداً کہا "اور سنا تو نے اوپر ساتھ اور

نیچے پانچ گر ہیں لگاتا۔ ہوا ذرا تیز ہے، اور پتنگ بھی زوردار ہے۔''

شمشیر نے ایسا ہی کیا اور پتنگ بڑھا کر کنور بلوان سنگھ سے کہا ''بلوان سنگھ! میں تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا تو سہی۔ اس دوباز سے مرزا نوشہ کی بتی بلوادوں۔''

کنور مسکرایا اور اپنی نامعلوم مونچھوں کو تاؤ دے کر اسد اللہ خان کی طرف دیکھا جو اپنا پتنگ بڑھانے میں مشغول تھا اور چلا کر کہا ''کیوں مرزا نوشہ! اس مانگ پاتی پتنگ سے تو مرزا چھیلا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے، سجاوٹ بھی انہی کے ہاتھ کی ہے۔ خوب اڑائے لے رہا ہے۔''

ادھر سے اسد اللہ نے کہا ''تو اور کیا؟''

ادھر سے کنور بلوان سنگھ چلایا ''مگر بھئی سنا مرزا نوشہ میں کھینچ گھسیٹ کے پیچ نہیں لڑاؤں گا۔ تم ٹھہرے سپاہی، مار دھاڑ کی سوجھتی ہے، میں تو ڈھیل کے پیچ لڑاؤں گا۔ کم از کم ہیٹی دو ہیٹی نخ پر ہو تو ہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔''

اسد اللہ نے پتنگ کو خوب ڈوری پلائی اور بلوان سنگھ کو جواب دیا ''کنور صاب! آپ دو نہیں تین ہیٹی پر پتنگ ملایئے۔ آج اس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نوشیر واں بنا کے چھوڑوں گا۔''

یہ سن کر بنسی دھر ذرا آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا ''کنور صاحب! سنتے ہیں، نو پیچ تو مرزا صاحب آپ کے سر پر چڑھ جائیں گے اور دسواں گیارھواں میرے آپ کے بیچ لڑے گا۔ میں اس دو باز سے آپ کا پیٹا کاڑوں گا اور ایک کے کنے لوں گا۔''

بلوان سنگھ ہنسا ''لالہ! تمہارے تو مچھیا رنڈی کنے لے گی۔ تم مجھ سے کیا پیچ لڑا سکتے ہو؟ اچھا رہی تم سے بھی آخر کے دو پیچ لڑیں گے۔''

شمشیر سنگھ چلایا ''بنسی دھر! تمہارے دو باز کو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر کاٹوں گا۔ تو سہی۔ قلا بازی کھاتا ہوا قلعے تک جائے۔ وہاں تلنگے تمہاری ادوباز لوٹیں اور تمہارا گن گائیں۔''

اس پر دونوں دوستوں نے خوب قہقہے لگائے۔ ادھر اسد اللہ خان نے، جس کی آنکھیں اوپر دو باز پر جمی تھیں، بنسی دھر سے، جو پتنگ بڑھا رہا تھا، کہا ''بنسی دھر! ہوا کا رخ برا معلوم ہوتا ہے۔ پتنگ ایک ہی لپیٹی پر بندول جانے لگا۔ اچھالا دو۔''

تھوڑی دیر کے بعد پیچ مل جاتے ہیں۔ لیکن بلوان سنگھ نے اپنا پتنگ روک کر ایک ایسا آرا ہاتھ مارا کہ اسد اللہ خان کٹ جاتا ہے۔ اس پر بلوان سنگھ اور اس کے ساتھی ایک شور برپا کر دیتے ہیں ''وہ کاٹا۔ مرزا نوشہ کٹ گئے۔''

اسد اللہ خاں بگڑ جاتا ہے اور سارا نزلہ یوسف اور بنسی دھر پر گرتا ہے "بنسی دھر! تمہاری جو بات ہے بے عقلی سے خالی نہیں۔ گدھے! نہیں گدھوں کے سردار ہو! تم نے بہت ہی کھر درا ماجھا رکھوایا، ورنہ یہ پیچ کٹنے والا نہ تھا" پھر یوسف پر بگڑنا شروع کیا "یوسف! تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان! اس نخ پر پتنگ نہ بڑھایئے۔"

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا "بھائی جان! میں نے تو عرض کیا تھا کہ مانجھا بہت کھر درا ہے اور اس پر ڈھیل کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دھوکا دیا۔ پہلے کہا، پیچ کھینچ پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔"

بنسی دھر نے چرخی تپائی پر رکھی اور کہا "چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں۔" مگر اسد اللہ، جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا، اور بھی بگڑ گیا "تم دونوں پتنگ بازی سے ناواقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے کھرے بیوقوف ہو، اُلو کی دُم فاختہ۔"

بنسی دھر نے غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی "خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا، آپ نے سینکڑوں پیچ کاٹے ہیں، آج بلوان نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔"

بہت دیر کے بعد مرزا اسد اللہ خان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ چوسر کی ایک بازی رہے۔ چنانچہ تینوں کوٹھے سے اترے اور گھر کا رُخ کیا۔

مرزا اسد اللہ خاں کے نانا خواجہ غلام حسین خاں زنان خانے سے باہر نکل رہے تھے کہ چلمن اٹھی اور امراؤ بیگم کی آواز آئی "نانا جان! آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔"

خواجہ غلام حسین نے اپنے قدم روک لیے اور پوچھا "کیوں امراؤ بیگم! خیر تو ہے۔"

امراؤ بیگم نے دروازے کی آڑ میں شرماتے ہوئے کہا "نانا جان! آپ خان کو منع بھی نہیں کرتے۔"

"کیسے بیٹا؟"

امراؤ بیگم اور زیادہ شرما گئی "خان ہی کو۔۔۔"

خواجہ سمجھ گئے "میں سمجھا مرزا نوشہ کو۔"

"جی ہاں، آپ ان کو منع ہی نہیں کرتے، دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں اور۔۔۔ اور شام کو روزانہ کنور بلوان سنگھ سے پتنگ بازی ہوتی ہے۔"

خواجہ صاحب نے سرد آہ بھری "میں جانتا ہوں۔"

امراؤ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا" پیسہ اُڑ رہا ہےاوران کے مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں۔میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی اس بات کو اُن پر جتاؤں۔"

خواجہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا"ہاں بیٹی! میں بھی کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور سے سمجھاؤں۔سو آج تم نے مجھے یاد دلا دیا۔میں ضرور کہوں گا،تم خاطر جمع رکھو۔"

امراؤ بیگم کو کچھ تسلی ہوئی"حضور! آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا خزانہ بھی تو خالی ہو جائے۔ذرا نہیں سمجھتے کہ آج۔۔۔" شرما جاتی ہے"ہم دو ہیں،کل تین ہو جائیں گے۔اپنے فضل وکرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اس کی پرورش تعلیم بھی تو ہے۔"

خواجہ صاحب مسکرائے"خدا تیری زبان مبارک کرے۔"

"جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ان کو نصیحت کیجیے،اگر سنیں گے تو وہ آپ ہی کو سنیں گے،مجھے تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتے۔"

خواجہ صاحب نے ڈیوڑھی کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا"اچھا بیٹی!لو میں آج ہی کہتا ہوں۔"

خواجہ صاحب جونہی ڈیوڑھی میں پہنچے،ان کی اسداللہ،بنسی دھر اور مرزا یوسف سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کشمیرن والے کٹڑے سے آ رہے تھے۔خواجہ صاحب نے اسداللہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا" صاحب زادے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ذرا ادھر آؤ۔" پھر یوسف اور بنسی دھر سے کہا" آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے،یہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"

بنسی دھر اور یوسف چلے جاتے ہیں۔خواجہ صاحب وہیں ڈیوڑھی میں اسداللہ خان سے مخاطب ہوتے ہیں"مرزا نوشہ! میرے اس سوال کا جواب دو۔مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ؟"

اسداللہ سٹپٹا گیا"نانا جان! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ نے مجھے پالا ہے،پرورش کی،آپ میرے بہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔"

خواجہ صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے"مرزا نوشہ!اب تمہاری عمر ماشاءاللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہے۔لیکن تمہارا شغل اب سوائے دن بھر چوسر کھیلنے اور شام کو پتنگ اُڑانے کے اور کچھ نہیں رہا۔دولت برباد کر رہے ہو بھائی! ہوش میں آؤ۔کوئی کمال حاصل کرو۔نام ونمود پیدا کرو۔اپنے بڑوں کی جائیداد میں اضافہ کرو۔"

خواجہ صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرزا اسداللہ کے استاد مولوی عبدالصمد

پارسی ایرانی آتے دکھائی دیے۔ مرزا اسد اللہ بڑھ کر کورنش بجا لایا ''السلام علیکم!''

ملا عبدالصمد صاحب مرزا اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور خواجہ صاحب سے کہا ''مزاج مبارک!''

خواجہ صاحب بھی مسکرائے ''الحمد للہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ آپ خوب وقت پر آئے۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا۔''

ملا صاحب ایک بار پھر اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ خواجہ صاحب نے کہنا شروع کیا ''میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی! اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو، ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو، ذرا لہو ولعب، کھیل کود سے ہاتھ اٹھاؤ، کچھ دنیا میں نام پیدا کرو، کوئی کمال حاصل کرو۔''

ملا عبدالصمد صاحب نے، جنھیں غالباً اسد اللہ خان نے کوئی اشارہ کیا تھا، اس سے کہا ''جاؤ بابا جاؤ۔ میں خواجہ صاحب سے باتیں کر کے ابھی تمہارے پاس آتا ہوں۔''

اسد اللہ خان نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد ملا صاحب خواجہ حسین خاں سے مخاطب ہوئے ''جناب خواجہ صاحب! برا نہ مانئے تو ایک بات عرض کروں۔''

خواجہ صاحب نے فوراً ہی کہا ''نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ فرمایئے، کیا ارشاد ہے؟''

ملا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی ''مرزا نوشہ آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا خان سے بھی زیادہ عہدہ ہفت ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا۔ ایسوں کے نام ان کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے۔''

خواجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے ''آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا، آپ کا مطلب کیا ہے؟''

مُلّا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا ''اسد اللہ خان بہت بڑا شاعر ہوگا۔ اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اسی کی بدولت روشن ہوگا۔ سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

خواجہ صاحب نے مُلّا عبدالصمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''مُلّا صاحب! میں تو حباب بر آب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جا رہے ہیں۔ باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے تو مرزا نوشہ فنِ شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یونہی سہی۔ خدا ایسے ہی کرے۔ آپ کے منہ میں گھی شکر۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ ادھر بنسی دھر کے مکان میں چوسر

بچھی ہوئی ہے اور اسد اللہ خان بُری طرح اس کھیل میں محو ہے۔بنسی دھر نے پانسہ پھینکا اور اسد اللہ خان سے کہا" رنگ تو آپ سب لے گئے، بدرنگ میں یہ دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں۔ ان کے لیے ساری اپنی گوٹیں لے کر کھڑا ہو جاؤں گا اور آپ کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچنے دوں گا"

اسد اللہ خان مسکرایا" یہ گوٹ تو پو بارہ یا سات چھ تیرہ سے اس گھر میں پہنچتی ہے۔ رہی دوسری تو وہ کچے بارہ سے گھر میں جاتی ہے۔ لو دیکھو پھینکتا ہوں۔"

بنسی دھر نے متنبہ کیا" پانسہ نہ بنا کر پھینکے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ اوپر تلے پانسے رکھ رہے ہیں۔"

اسد اللہ خان نے ہاتھ روک لیا اور بنسی دھر سے کہا" اب روتے ہو" پھر پانسہ پھینکا" یہ پاؤ بارہ۔ وہ مارا۔ پاؤ بارہ۔ لو کچے بارہ بھی لو۔ لو یہ کچے بارہ دیکھ لو کچے بارہ دھرے پڑے ہیں۔ یوں یہ پانسہ پھینکتے ہیں۔"

مرزا یوسف نے، جو بغل میں بیٹھا تھا، کہا" بھائی جان! آپ کی پشت پر جوگنی ہے جوگنی۔"

اسد اللہ خان نے ذرا اُوَن کی لی" کہو، بنسی دھر چھ تین تو پھینکوں؟"

بنسی دھر مسکرایا" چھ تین تو کہیں آئے نہ ہوں۔"

اسد اللہ خان نے بڑی پھرتی سے پانسہ پھینکا، پر چھ تین نہ آئے۔ اسی پانسے پر بازی رکی پڑی تھی کہ اتنے میں خواجہ حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دی" حضور! آپ کے نانا جان کی بری حالت ہے، دل پکڑے کراہ رہے ہیں۔"

اسد اللہ سخت متحیر ہوا۔" ارے بھئی ابھی ابھی تو میں ان کو ملا صاحب کے ساتھ اچھا بھلا چھوڑ کر آیا ہوں۔" بازی کا خیال آیا تو زچ پیچ ہو کر کہا" اور یہاں بازی چھ تین پر رُکی ہوئی ہے۔"

اسد اللہ خان اٹھنے لگا تو بنسی دھر نے کہا" مرزا نوشہ! اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں یا چھ تین تو پھینکتے جایئے یا ہار مان لیجیے۔"

اسد اللہ نے جواب دیا" بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں، تم یونہی بازی بچھی رہنے دو۔" اور ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ گھر پہنچا تو کہرام مچا ہوا تھا۔ خواجہ غلام حسین بعارضہ دل انتقال کر چکے تھے۔

اپنے نانا کے انتقال کے بعد اسد اللہ خان کی لاابالی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ بیگم کی شکائتیں بڑھتی گئیں۔ آخر نواب احمد بخش اپنے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کے یہاں گئے اور کہا" نواب الٰہی بخش! مرزا نوشہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی خوب پَر نکالے اُڑانے

شروع کیے ہیں۔ میرے خیال میں اگر ان کا یہی عالم رہا تو جائیداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ بھتیجی اور بیٹی میں کیا فرق ہے، جیسے امراؤ بیگم تمہاری بیٹی ویسی میری۔''

نواب الٰہی بخش نے باادب پوچھا ''تو پھر بھائی جان! کیا کیا جائے؟''

نواب احمد بخش نے رائے دی ''یہ کیا جائے کہ تم مرزا نوشہ کو اپنے پاس بلالو اور اپنی نگرانی میں رکھو۔'' اور پھر تاکیداً کہا ''دیر نہ کرو، جلد جاؤ اور اس کو لے آؤ کہ اس میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے وہ بھی چٹ کر جاتا ہے اور میں سنتا ہوں، ماں سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائیداد و املاک پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔ تم اس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلّی چلے آؤ۔''

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا اسد اللہ خاں کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلّی جانا پڑا، جہاں اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی نگرانی میں اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

(تلخ، ترش اور شیریں)

○○○

غالب اور چودھویں

مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا ہے اور اسے مار رکھا ہے۔"

۱۲۶۴ھ میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجود یہ کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ رومانی ازلی تکون تو "ستم پیشہ ڈومنی" اور "کوتوال دشمن تھا" کے مختصر الفاظ مکمل کر دیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی؟ آیئے ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر بناتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے۔ مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے جسے چار کہار لیے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چلتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی۔

ایک فقط نواب شیفتہ نے اس کے کلام کو سراہا۔ صدر الدین آزردہ نے اس کی حوصلہ افزائی

کی۔لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔مرزا نوشہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا تھا کیونکہ وہ استادِ شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشہ اٹھ کر چلا آیا۔وہ اور زیادہ کوفت نہیں اٹھا سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا۔کہاروں نے پوچھا ''حضور! کیا گھر چلیں گے؟''

مرزا نوشہ نے کہا ''نہیں۔ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے۔ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں۔''

کہار بہت دیر تک مرزا نوشہ کو اُٹھائے پھرتے رہے۔جس بازار سے بھی گزرے وہ سنسان تھا۔چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔اس کی روشنی اداس ہوگئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار سے ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی۔بھیرویں کے سُر تھے۔تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آئی۔مرزا نوشہ چونک پڑا۔اسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سُروں پر تیر رہا تھا۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آواز میں درد تھا، جوانی تھی۔لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔دُور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جمائیاں لے رہی ہے۔چاندنی بچھی ہوئی ہے۔اس کی سلوٹوں سے اور موتیے اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ محفلِ رقص و سرود کو ٹھنڈا ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلونی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے، جو گاؤ تکیئے پر سر رکھے اپنی مخروطی انگلیاں چٹخا رہی تھی، کہا ''کون ہے؟ شیفتہ ہے، آزردہ ہے۔۔۔استاد شاہ ذوق ہے۔۔۔سمجھ میں نہیں آتا کل کے اس مبتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھرا ہے کہ جب نہ تب تو اسی کی غزل گائے گی!''

نوچی مسکرائی۔اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے چمک پیدا ہوئی۔ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا۔

''دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اس نے کہا۔میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔''

ملکہ جان نے پہلے سے بڑی زیادہ لمبی جمائی لی اور کہا ''بھئی اب سو بھی چکو۔بہت راہ دیکھی جمعدار حشمت خان کی۔''

شوخ چشم نوچی نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بازو اوپر لے جا کر ایک جمائی لیتے ہوئے

کہا" بس آتے ہی ہوں گے۔ میں نے تو ان سے کہا تھا، مرزا غالب کے آگے سے جونہی شمع ہٹے وہ ان کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں۔"

ملکہ جان نے برا سا منہ بنایا" اس نگوڑے مرزا غالب کے لیے ایک تو اپنی نیندیں بھی حرام کرے گی تو۔"

نوچی مسکرائی۔ سامنے قدن میاں سارنگی پر ٹھوڑی ٹکائے پینک میں اونگھ رہا تھا۔ نوچی نے طنبورہ اٹھایا اور اس کے تار ہولے ہولے چھیڑنا شروع کیے۔ پھر اُس کے حلق سے خود بخود اشعار راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

قدن میاں ایک دم چونکا۔ آنکھیں مندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اس کا گز چلنے لگا۔

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبۂ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

گانے والی کی تسکین نہ ہوئی، چنانچہ اس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا:

میں بلاتی ہوں ان کو مگر اے جذبۂ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ملکہ جان ایک دم چونکی۔ اس نے نوچی کو اشارہ کیا۔ وہ بھی چونک پڑی۔ سامنے دہلیز میں مرزا نوشہ ایستادہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اُٹھی اور تسلیمات بجالائی۔ نوچی نے بھی اٹھ کر کھڑے قد تعظیم دی، یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں۔ ملکہ استقبال کے لیے آگے بڑھی" آیئے آیئے! تشریف لایئے۔ زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ غریب کو سرفراز فرمائیں۔ آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہو گیا۔"

مرزا نوشہ نے حسنِ ملیح کے نادر نمونے کی طرف دیکھا۔ نوچی نے جھک کر کہا" آیئے ادھر مسند پر تشریف رکھیے۔"

مرزا نوشہ ذرا تامل کے بعد بیٹھ گیا اور کہنے لگا" تمہارا گلا بہت سریلا ہے اور تمہاری آواز میں درد ہے۔ نہ جانے کیوں بے کھٹکے اندر چلا آیا۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

نوچی نے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا" جی مجھے چودھویں کہتے ہیں۔"

مرزا نوشہ مسکرایا" یعنی آج کی رات!"

چودھویں مسکرا دی۔ مرزا نوشہ نے کہا" بھی خوب گاتی ہو۔"

چودھویں نے حسب دستور جواب دیا کہ" آپ مجھے بنا رہے ہیں۔"

مرزا نوشہ کو جگت سوجھی" بنائی تر کاری سبزی جاتی ہے، تم کو تھوڑے ہی بنایا جا رہا ہے۔"

چودھویں کو کچھ جواب دینا ہی تھا، چنانچہ اس نے کہا" خوب، خوب، یہ بھی خوب۔ میں بنی بنائی ہوں، اللہ نے مجھے بنایا۔"

مرزا نوشہ نے مزید جگت کی" اللہ نے سبھی کو بنایا ہے، پر تم بنی ابھی نہیں بنی ہو۔"

چودھویں کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے چمکیلے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ مرزا نوشہ نے فرمائش کی" ضلع جگت کو چھوڑو اور ذرا پھر وہی غزل گاؤ۔ نہ معلوم کس کی غزل ہے۔۔۔ نکتہ چیں ہے غم دل۔۔۔ ذرا شروع کرو۔"

چودھویں کو فرمائش کا یہ انداز کچھ پسند نہ آیا، چنانچہ اس نے ذرا ٹنک کر کہا" یہ غزل غالب کی ہے اور غالب کو سمجھنا کوئی سہل نہیں۔"

مرزا نوشہ نے پوچھا" کیوں؟"

" سمجھے تو کوئی پتے کا ر سمجھے۔ آپ ایسے نوجوان کیا سمجھیں گے۔"

مرزا نوشہ مسکرایا" بھئی بتا کے گا ؤ تو کچھ بھاؤ کے انگوں سے شاید سمجھ لوں۔"

اب چودھویں کو جگت سوجھی۔ پھلکی سی ناک چڑھا کر کہا" بھاؤ کا بھاؤ مہنگا پڑے گا۔"

مرزا نوشہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر چودھویں سے مخاطب ہوا۔

" آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے؟"

ملکہ جان، جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی، مرزا نوشہ سے مخاطب ہوئی" حضور! کئی بار کہہ چکی ہوں، اُس سے بہتر ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفتہ ہے۔ سب مانے ہوئے استاد ہیں۔ پر اسے نہ جانے اُس عطائی غالب کے کلام میں کیا خاص بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے گی۔"

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھویں کی طرف دیکھا اور کہا" ایسی کوئی خاص بات ہو گی۔"

چودھویں سنجیدہ ہو گئی" یہ تو وہی سمجھے جس کو لگی ہو۔"

مرزا نوشہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا" کیا میں سن سکتا ہوں، وہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے؟"

چودھویں نے سرد آہ بھری" نہ پوچھیے! کہاں میں ایک غریب ڈومنی، کہاں غالب۔۔۔ جانے

دیکھیے اس بات کو۔۔۔ کہیئے آپ کس کی غزل سنیں گے؟''

مرزا نوشہ مسکرایا''غالب کی۔اور کہیئے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے چلوں۔چودھویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے۔''

چودھویں اس کا مطلب نہ سمجھی''مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے۔۔۔خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک۔''

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی، اب بالکل دور ہو چکی تھی۔ان کے سامنے سانولے سلونے رنگ والی لڑکی بیٹھی تھی جس کو اس کے کلام سے بھی والہانہ محبت تھی۔یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی، مرزا نوشہ بہت دیر تک گفتگو کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے پوچھا''کیا تم نے کبھی غالب کو دیکھا؟''

چودھویں نے مختصر جواب دیا''نہیں۔''

مرزا نوشہ نے کہا''میں انہیں جانتا ہوں۔بہت ہی بگڑے رئیس ہیں۔تم چاہو تو میں انہیں لاسکتا ہوں یہاں۔''

چودھویں کا چہرہ تمتما اٹھا''سچ!''

مرزا نے کہا''میں کوشش کروں گا۔''اور یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا''میرا کلام سنو گی؟''

چودھویں نے رسمی طور پر کہا''سنائیے۔ارشاد!''

مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا''یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں، پر تمہیں تو غالب کے کلام سے محبت ہے، میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا!''

چودھویں نے پھر رسمی طور پر کہا''جی نہیں، کیوں پسند نہ آئے گا۔آپ ارشاد فرمائیے۔''

مرزا نوشہ نے ابھی اس غزل کے دو ہی شعر سنائے ہوں گے جو اس نے مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا''آپ اس مشاعرے میں شریک تھے جو مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں ہو رہا تھا؟''

مرزا نوشہ نے جواب دیا''جی ہاں۔''

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا''غالب تھا؟''

مرزا نوشہ نے جواب دیا''جی ہاں۔''

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا''کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو سنائیے۔''

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا ''اس وقت کوئی یاد نہیں آرہا۔''

اس نے اب مذاق کو زیادہ طول نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے ہاتھ کی بنی ہوئی لی، خاصدان میں ایک اشرفی رکھی اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اترا تو سیڑھیوں کے پاس مرزا نوشہ کی مڈبھیڑ جمعدار حشمت خان سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آرہا تھا۔ حشمت خان اس کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا ''مرزا نوشہ! آپ یہاں کہاں؟''

مرزا نوشہ خاموش رہا۔ حشمت خاں نے معنی خیز انداز میں کہا ''تو یہ کہیے کہ آپ کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر ہوتا ہے؟''

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا ''فقط آج۔ اور وہ بھی اتفاق سے۔ خدا حافظ!''

یہ کہہ کر وہ ہوادار میں بیٹھ گیا اور حشمت خاں اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اُس کی طرف بڑھی ''کہیے غالب کی غزل لائے؟''

حشمت خاں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ غزل کا کاغذ جیب سے نکالا اور بڑبڑایا ''لایا ہوں۔۔۔ لو۔'' چودھویں نے اشتیاق سے کاغذ لیا تو حشمت خان نے ذرا لہجے کو درست کرتے ہوئے کہا ''پر غالب تو ابھی تمہارے کوٹھے سے اتر کر گئے۔۔۔ یہ ماجرا کیا ہے؟''

چودھویں چکرا سی گئی ''غالب میرے کوٹھے پر۔۔۔ ابھی ابھی اتر کر گئے۔۔۔ مجھے دیوانہ بنا رہے ہو۔۔۔ میرا کوٹھا کہاں، غالب کہاں؟''

جمعدار نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا ''واقعی سچ کہتا ہوں۔ وہ غالب تھے جو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے۔''

چودھویں اور زیادہ چکرا گئی ''جھوٹ!''

''نہیں چودھویں سچ کہہ رہا ہوں۔''

چودھویں نے پاگلوں کی طرح حشمت خاں کو دیکھنا شروع کیا۔ ''میری جان کی قسم! غالب تھے؟ جھوٹ۔ مجھ کو بنا رہے ہو۔ اللہ! سچ کہو، غالب تھے؟''

حشمت خاں بھنا گیا ''ارے تمہاری ہی جان کی قسم! غالب تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف مرزا نوشہ جو اسد بھی تخلص کرتے ہیں۔''

چودھویں بھاگی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی ''ہائے میں مرگئی! غالب تھے!'' نیچے جھانک کر دیکھا مگر بازار خالی تھا۔ ''میرا ستیاناس ہو۔ میں نے خان کی خاطر مدار بھی نہ کی۔''

یہ کہہ کر اس نے غزل کا کاغذ کھول کر دیکھا اور سر پیٹ لیا ''اللہ! یہ خواب ہے یا بیداری۔ سچ ہے تو وہ غالب ہی تھے۔ سو میں غالب ہزار میں غالب تھے، جمعدار صاحب! سچ کہا آپ نے، ضرور غالب تھے۔ ہائے میں نے ان سے کہا، آپ غالب کے کلام کو کیا سمجھیں گے۔ میں مرجاؤں۔۔۔ بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے۔۔۔ ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اُف نہ معلوم میں کیا کیا اُن سے کہہ گئی۔''

یہ کہتے کہتے اس نے غزل کا کاغذ منہ پر پھیلایا اور رونے لگی۔

(تلخ، ترش اور شیریں)

ooo

غالب، چودھویں اور حشمت خاں

مرزا غالب آگرہ سے دہلی چلے آتے ہیں۔ یہ سن اٹھارہ سوسترہ یا اٹھارہ کا ذکر ہے۔
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔اس میں مومن، ذوق، شیفتہ، آزردہ اور غالب کے علاوہ اس زمانے کے اور شعرا بھی شریک تھے۔

آزردہ صاحب نے تحت اللفظ اپنی تازہ غزل پڑھی، جس کے اس شعر پر اس کو کافی داد دی گئی

سے آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

پھر مومن نے خوش الحانی سے جب یہ شعر پڑھا تو تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔

سے بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

مومن نے پوری غزل ابھی ختم نہیں کی تھی کہ داد کے شوروغل میں حاضرین سے کہا، آپ لوگوں کی عنایت ہی تو ہماری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں

سے ہم داد کے خواہاں نہیں طالب زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

شیفتہ اونچی آواز میں پکارے

سے تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

اس کے بعد ذوق کے سامنے شمع آئی۔ان کے اس شعر پر بہت داد دی گئی:

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

سب سے آخر میں غالب آئے اور حاضرین سے کہا، لیجیے حضرات! میں بھی ایک بھیرویں الاپتا ہوں:

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

شیفتہ نے بے اختیار کہا، سبحان اللہ!۔۔۔سبحان اللہ!

غالب نے پھر شعر سنایا:

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

صرف شیفتہ اور آزردہ تھے جنھوں نے غالب کے کلام کی داد دی۔ ذوق چونکہ استادِ شاہ تھے اس لیے ان ہی کے کلام کو سراہا گیا۔ چنانچہ غالب افسردہ دل مشاعرے سے اٹھ گئے۔ اپنے ہوادار میں بیٹھے اور گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ پچھلی رات کا وقت تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ایک موڑ مڑے کہ ان کے کانوں میں کسی عورت کے گانے کی آواز آئی:

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبۂ عشق
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

مرزا نوشہ نے کہاروں کو حکم دیا کہ ہوادار روک لو۔ ہوادار رکا، غالب اترے۔ آہستہ آہستہ اس گھر کا رخ کیا جہاں سے آواز آرہی تھی۔ جو غزل گائی جا رہی تھی، خود غالب ہی کی تھی۔

جب وہ سیڑھیوں کو طے کر کے اوپر کوٹھے پر پہنچے تو مغنیہ کی آواز سنائی دی:

میں بلاتی تو ہوں ان کو مگر اے جذبۂ عشق
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غالب کمرے میں داخل ہو رہے تھے جب ان کا یہ شعر ترمیم کے ساتھ گایا جا رہا تھا۔ دلّی کی مشہور ڈومنی چودھویں، جو سانولے رنگ کی تھی، تانبورہ لیے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے جب غالب کو آتے دیکھا تو کھڑے ہو کر تعظیم دی۔

چودھویں کا چاند روشن تھا۔۔۔غالب کمرے میں داخل ہوئے۔ اب آپ ان کا مکالمہ سنیے۔

چودھویں: آیئے آیئے ،تشریف لایئے۔ زہے قسمت کہ آپ رئیس مجھ ایسی غریب ڈومنی کو سرفراز فرمائیں۔ آپ کے آنے سے گھر روشن ہوگیا۔ آیئے ادھر مسند پر تشریف رکھئے۔

غالب: (بیٹھ کر ذرا تامل کے بعد) تمہارا گلا بہت سریلا ہے اور تمہاری آواز میں بہت درد ہے۔ جانے کیوں بے کھٹکے یوں اندر چلا آیا۔۔۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟

چودھویں: جی مجھے چودھویں کہتے ہیں۔

غالب: یعنی آج کی رات۔۔۔ بھئی خوب گاتی ہو۔

چودھویں: آپ مجھے بنا رہے ہیں، میں کس قابل ہوں!

غالب: (مسکرا کر) بنائی تر کاری سبزی جاتی ہے۔ تم کو تھوڑے ہی بنایا جاسکتا ہے؟

چودھویں: خوب، خوب، یہ بھی خوب، میں بنی بنائی ہوں، اللہ نے مجھے بنایا۔

غالب: اللہ نے تو سب ہی کو بنایا ہے۔ پر تم بنی (دلہن) ابھی نہیں بنی ہو۔ ذرا پھر وہی غزل گاؤ۔ نہ معلوم کس کی غزل ہے؟ ہاں شروع کرو۔

چودھویں: یہ غزل غالب کی ہے اور غالب کا سمجھنا کوئی سہل نہیں۔

غالب: بھاؤ بتا کے گاؤ تو کچھ بھاؤ کے انگوں سے شاید سمجھ لوں۔

چودھویں: بھاؤ کا بھاؤ مہنگا پڑے گا۔

غالب: آج کل تو بازار کا بھاؤ دن پر دن گرتا جارہا ہے۔ مہنگی سے مہنگی کوڑیوں کے مول بک رہی ہے۔

چودھویں: (ایک ادا سے) مجھے ضلع جگت نہیں آتا۔ اچھا غزل سنئے:

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب: خوب گاتی ہو، اور یہ غزل تو خاص طور پر خوب گا رہی ہو۔ گائے جاؤ۔

چودھویں: سنئے جناب! یوں تو ذوق، مومن، نصیر، شیفتہ، سب ہی خوب کہتے ہیں، پر غالب کے کلام

میں ایک خاص بات ہے۔۔۔آپ کیا سمجھیں گے؟ یہ تو وہی سمجھے جس کو لگی ہو۔

غالب: کیا میں سن سکتا ہوں وہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے؟

چودھویں: نہ پوچھئے (سرد آہ بھر کر) کہاں میں ایک غریب ڈومنی، کہاں غالب! جانے دیجیے اس بات کو، کچھ اور بات کیجیے۔

غالب: کہئے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے چلوں۔ چودھویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے۔

چودھویں: مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے! اس کافر نے تو کہا ہے:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب: (مسکرا کر) یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں، پر آپ کو تو غالب کے کلام سے محبت ہے۔ میرا کلام آپ کو کیا پسند آئے گا۔ اگر کہیے تو دو چار شعر سنا دوں۔

چودھویں: سنائیے!

غالب: (وہی غزل سناتے ہیں جو کہ مشاعرہ میں بڑھ کر آئے تھے) سنئے:

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

چودھویں: نہیں، آپ کے شعر بھی خیر اچھے ہیں، وہ بات غالب کے شعروں کی کہاں!

غالب: (روکھے پن سے) جی ہاں یہ تو بالکل درست ہے۔ اچھا تو اب اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو بہت تکلیف دی۔

چودھویں: اچھا پان تو کھاتے جائیے۔ (خاصدان پیش کرتی ہے)۔

غالب ایک گلوری کھا کر خاصدان میں ایک اشرفی رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ غالب جل بھن کر چودھویں کے کوٹھے سے اترتے ہیں تو حشمت خان جمعدار سے (جو آگے چل کر کوتوال ہو گیا، اور جس نے مرزا کو قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیا) مڈبھیڑ ہوئی۔ جمعدار اُن کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ ''مرزا نوشہ! آپ یہاں کہاں؟''

غالب نے اس سے کہا" اماں تجاہل عارفانہ کرتے ہو۔سب کچھ دیکھ چکے۔"
جمعدار حشمت خان مسکرایا "یہ کہئے کہ آپ کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر ہوتا ہے۔"
غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا" فقط آج، وہ بھی اتفاق سے۔ معاف کیجئے گا جمعدار صاحب!۔۔۔خدا حافظ!"

یہ کہہ کر مرزا نوشہ ہوا دار میں بیٹھے اور گھر کو روانہ ہو گئے۔ حشمت خان کوٹھے پر چلے گئے۔
چودھویں سے ان کا کچھ معاملہ تھا، مگر طے نہیں پایا تھا۔ چودھویں ان سے پہلا سوال یہ کرتی ہے۔ میں ان کی گفتگو مکالمے میں پیش کرتا ہوں۔

چودھویں: کہئے غالب کے اس وقت کے مشاعرے کی غزل لائے؟

جمعدار: واقعی سچ کہتا ہوں۔ وہ غالب خود تھے جو ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے ہیں۔

چودھویں: میری جان کی قسم غالب تھے۔۔۔جھوٹ۔۔۔مجھ کو بنا رہے ہو۔ اللہ! سچ کہو، غالب تھے؟

جمعدار: ارے تمہاری جان کی قسم! یہ غالب تھے۔ یہی مرزا اسداللہ خاں غالب المعروف مرزا نوشہ تھے، جو اسد تخلص کرتے ہیں۔

چودھویں: ہائے میں مرگئی۔ یہ غالب تھے! میرا ستیاناس ہو۔ میں نے ان کی کوئی خاطر مدارات بھی نہ کی۔ (غزل کا کاغذ دیکھ کر) اللہ! یہ خواب ہے یا بیداری۔۔۔سچ ہے۔ وہ تو غالب ہی تھے۔ سو میں غالب ہزار میں غالب۔ جمعدار صاحب! سچ کہا آپ نے، ضرور غالب تھے؟ ضرور غالب تھے۔ ہائے میں نے تو ان سے کہا، آپ کیا غالب کے کلام کو سمجھیں۔ میں مر جاؤں۔۔۔بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے۔۔۔ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اُف نہ معلوم کیا کیا ان سے کہہ گئی۔۔۔!

غالب دیوان خانے میں داخل ہونے لگے، اس وقت صبح صادق ہو چکی تھی اور ان کے خسر نواب الٰہی بخش نماز کو اٹھے تھے۔ ہاتھ میں لوٹا تھا۔ غالب کی ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

الٰہی بخش: کیوں جناب! آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟

غالب: جی مشاعرہ سے آرہا ہوں۔

الٰہی بخش: مشاعرہ کل سے ہو رہا ہے اور آج بارہ بجے شب کو ختم ہو گیا۔ اور اب تو پانچ بجنے والے ہیں۔

غالب: مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کچھ دوستوں سے باتیں ہوتی رہیں اس لیے دیر ہو گئی۔

الٰہی بخش: کیا خوب! نہ معلوم کہاں سے آپ گھومتے گھماتے آ رہے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو، آپ سیدھے مشاعرے سے تو نہیں آ رہے۔

غالب: جیسا آپ فرمارہے ہیں ایسا ہی ہوگا۔

پہلو بچا کر غالب اندر داخل ہوئے۔ ان کی بیوی نے ان سے کہا، ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ انتظار کرتے کرتے دیدے پتھرا گئے، اب آ رہے ہیں۔ اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، مگر وہ کہاں۔ سلامتی سے صبح ہوتے اب آپ تشریف لائے ہیں۔۔۔ ہائے اب آئے ہیں تو اندر کیوں نہیں آتے۔

غالب: (جوتا اُتارتے ہوئے) آتا ہوں حضور! ذرا جوتا اُتار لوں تو گھر میں داخل ہوں۔ ساری رات تہجد پڑھی گئی ہے۔ کہیں مصلّے بچھا ہے، کہیں رحل رکھی ہے، کہیں وضو کی چوکی ہے۔ گھر مسجد بنا ہوا ہے۔ میں ہوا شرابی کبابی، ایک عابدہ زاہدہ بیوی کے گھر میں جوتے سمیت کس طرح گھس جاؤں؟

امراؤ بیگم: اب نخرے نہ کیجیے۔۔۔ اندر تشریف لایئے۔ (غالب کو کھڑے سوچتے دیکھ کر) میں کب تک کھڑی رہوں۔ تو آیئے۔ ورنہ میں رات بھر کی جاگی تھوڑی دیر جا کر مر رہوں۔

غالب: مریں آپ کے دشمن۔۔۔ لیجیے میں حاضر ہو گیا۔ (گھر میں داخل ہوتے ہوئے غالب نے کہا) پر مجھ سے آپ کے والد صاحب قبلہ کی روک تھام اور ہر بات کی پوچھ گچھ نہیں سہی جاتی۔ مجھے یہ روک ٹوک بری معلوم ہوتی ہے۔ میں اب الگ مکان میں رہنا چاہتا ہوں۔ کل ہی مجھ سے شاہ نصیر الدین صاحب یعنی میاں کالے صاحب کہہ رہے تھے، آپ میری حویلی میں چلے آیئے، آپ سے میں کرایہ نہیں لینا چاہتا۔ ارادہ ہے کل ہی یہاں سے اٹھ جاؤں۔ آپ کیا کہتی ہیں؟

امراؤ بیگم: مجھ سے کیا کہتے ہو۔ بھاڑ پر بھی لے چلیں گے تو چلی چلوں گی۔

ادھر چودھویں کے بالاخانے پر حشمت کا چودھویں سے مکالمہ سنیے۔

حشمت خاں: چودھویں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج دو ڈھائی برس ہو گئے تم اداس سی رہتی ہو۔ تم میں وہ شگفتگی نہیں۔

چودھویں: چنگی بھلی تو ہوں۔ کھاتی ہوں، پیتی ہوں، ہنستی ہوں، بولتی ہوں۔ اب شگفتگی اور کس جانور کا نام ہے!

حشمت خاں: جذبات کا وہ دریا جو تمہاری زندگی کے ساتھ ساتھ بہتا ہی رہتا تھا، کھڑے پانی کی طرح ٹھہر گیا ہے۔ آخر اس کی وجہ؟

چودھویں: خان صاحب! چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اچھا بتایئے، مرزا نوشہ کو ایک بار آپ کیا میرے گھر میں لاسکتے ہیں؟ اور چاہیں تو آپ ضرور لاسکتے ہیں۔

حشمت خاں: جب دیکھو تم کو مرزا نوشہ کی پڑی رہتی ہے۔ ہو نہ ہو اُس دن کی ملاقات میں تم نے ان سے کوئی خاص رابطہ پیدا کر لیا ہے۔ کیوں ہے نا؟

چودھویں: جی حضرت! بات یہ ہے کہ وہ میرے ہاں آئے، میں نے ان کو نہ پہچانا اور جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں ان سے کرتی رہی۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ کیسی بدتمیز عورت ہے۔

چودھویں: اچھا تو کیا ہوا جو سمجھتے ہیں، ان کو سمجھنے دو۔ تمہارے لیے یہ عزت کم ہے کہ ایک شہر کے نامی افسر کی تم داشتہ ہو۔

چودھویں: یہ خوب بات کہی آپ نے کہ کوئی تمہیں بے وقوف بدتمیز سمجھتا ہے تو سمجھنے دو۔ دراصل تو آپ پرلے درجے کے بدگمان واقع ہوئے ہیں۔

حشمت خاں: یعنی عجب بات ہے کہ دنیا بھر کی فرمائشیں تمہاری پوری کروں، روپیہ پانی کی طرح تمہارے یہاں میں بہاؤں اور تم غیروں کی محبت کا دَم بھرتی رہو تو مجھے برا معلوم نہ ہو۔ اب تم صاف انکار کرتی ہو تو خیر ہوگا۔

چودھویں: ابھی بھی خیر ہوگا۔۔۔ارے میرے بدن میں کیڑے پڑیں جو میں نے مرزا نوشہ سے کچھ وہ کیا ہو۔۔۔اور جھوٹا الزام لگانے والے کو میں کیا کہوں۔

حشمت خاں: اچھا بھئی! مرزا نوشہ کی اک دعوت کیے دیتا ہوں اور یہ جھگڑا ہی چکا دیتا ہوں۔۔۔ایک بار اور ان کو جی بھر کر دیکھ لو اور یہ قصہ ہی ختم ہو۔

دوسرے روز حشمت خاں نے ایک دعوت ترتیب دی اور مرزا غالب کو بھی مدعو کیا۔ ذرا اُن کے مکالمات سنیے۔

غالب: ہائیں جمعدار! یہاں تو سناٹا پڑا ہے، ابھی کوئی نہیں آیا۔

حشمت خاں: یوں کیوں نہیں کہتے کہ اندھیرا پڑا ہے۔ چودھویں آئے تو ابھی چاندنی چھٹک جائے۔

غالب: سچ تو یوں ہے کہ آپ کے گھر میں چودھویں ہی کے دَم سے روشنی ہے۔ جھکڑیوں کی جھنکار

اور آپ کی تیز گفتار کے سوا یہاں دھرا ہی کیا ہے۔

حشمت خاں: کیا خوب! اچھی شاعری رہی۔ اے لیجیے، وہ دو تین اور احباب، جن کو میں نے مدعو کیا تھا، آ گئے۔ آیئے جناب جمیل احمد خاں صاحب! آیئے۔ اور بھئی سرور خاں! تم نے تو بہت دیر کر دی۔

منے خاں!

منے خاں: جی سرکار! کیا حکم ہے؟

حشمت خاں: بھئی چودھویں ابھی تک نہیں آئیں۔۔ کیا وجہ؟

منے خاں: جی بہت دیر سے آئی لال کمرے میں بیٹھی ہیں۔ سماجی بھی سارے حاضر ہیں۔

حشمت خاں: تو بیڑا دے دو محفل میں آ جائیں، گانا شروع ہو۔

منے خاں دوسرے کمرے میں گئے اور بی چودھویں کو بیڑا دیا۔ چودھویں مع اپنے سماجیوں کے محفل میں آ کھڑی ہوئی۔ طبلہ سارنگی سے ملنے لگا، لہرا بجنے لگا اور بی چودھویں نے ناچنا شروع کیا۔

جمیل احمد: (داد دیتے ہوئے) بی چودھویں! کیا ناچ کے انگوں میں بھاؤ بنا رہی ہو؟

چودھویں: (توڑے لے کر تسلیم بجالاتے ہوئے) آپ رئیس لوگ قدر دانی فرماتے ہیں، ورنہ میں ناچنا کیا جانوں!

سرور خاں: سچ تو یہ ہے بی چودھویں! تم ناچتی ہو تو معلوم ہوتا ہے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔

جمیل احمد: اماں گل ریز نہیں کہتے۔ (غالب کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں مرزا نوشہ صاحب! صحیح عرض کر رہا ہوں نا؟

غالب: میں تو نہ پھلجھڑی کہوں گا اور نہ گل ریز، بلکہ یوں کہوں گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مہتاب چھوٹ رہی ہے۔

جمیل احمد: واہ واہ! کیوں نہ ہو۔ شاعر ہیں نا شاعر۔ چودھویں کا ناچ اور مہتاب۔ نہ پھلجھڑی نہ گل ریز۔۔۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

حشمت خاں: ایک تو یوں ان بی صاحبہ کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے، آپ لوگ اور ساتویں آسمان تک پہنچا رہے ہیں۔

چودھویں: (ناچتے ہوئے ایک ادا سے) جی ہاں۔آپ کو تو بس کیڑے ڈالنے آتے ہیں۔
حشمت خاں: اچھا حضرات! سنئے، بی چودھویں جس وقت ناچتی ہیں معلوم ہوتا ہے پانی پر مچھلی تیر رہی ہے۔اب خوش ہوئیں۔
چودھویں: دماغ کہاں پہنچا ہے۔سڑی بدبودار مچھلی۔ دُور پار۔نوج میں کیا مچھلی ہوں۔
(فرمائشی قہقہے لگتے ہیں۔حشمت خاں کو چودھویں کا جواب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔اتنے میں چودھویں غالب کی ایک غزل گانا شروع کرتی ہے)۔

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: کیا گلا پایا ہے۔۔۔گاتی رہو۔۔۔اسی طرح گاتی رہو۔
حشمت خاں: (جل بھن کر) ارے ہٹاؤ یہ غزلیں وزلیں، کوئی ٹھمری دادرا گاؤ۔
(چودھویں غزل گانا بند کر دیتی ہے اور یہ ٹھمری گاتی ہے: (پیا بن نا آوت چین)۔
حشمت خاں: (گانے کے دوران خدمت گار کو آواز دیتا ہے) جان محمد! جان محمد! وہ میرا صندوقچہ لانا۔
جان محمد: کون سا صندوقچہ حضور؟
حشمت خاں: ارے وہی جس میں کل میں نے تمہارے سامنے زیورات لاکر رکھے ہیں۔
گانا جاری رہتا ہے۔۔۔اس دوران خدمت گار صندوقچہ لاکر جمعدار کے سامنے رکھ دیتا ہے۔۔۔"یہ لیجیے سرکار! صندوقچہ۔"
حشمت خاں: (ایک جڑاؤ گلوبند نکال کر) چودھویں! ادھر دیکھو۔۔۔یہ گلوبند کس کا؟
چودھویں: (ایک ادا کے ساتھ) میرا!
حشمت خاں: (جڑاؤ جھالے نکال کر) چودھویں! یہ جھالے کس کے؟
چودھویں: میرے!
حشمت خاں: (کڑے نکال کر) یہ کڑوں کی جوڑی کس کی؟
چودھویں: میری!

حشمت خاں: اچھا بتاؤ۔۔۔ چودھویں کس کی؟

چودھویں: (رُک کر دبی آواز میں ہولے سے) آپ کی!

حشمت خاں: (غالب سے) آپ بھی گواہ رہیے۔

غالب: سازش کے مقدمے میں گواہی مجھ سے دلواتے ہو؟

حشمت خاں: تم نے نہیں سنا؟

غالب: (اٹھ کر محفل سے جاتے ہوئے) نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا اور دوسرے مجھی سے مقدمہ اور مجھی سے گواہی۔۔۔ غضب۔۔۔ اندھیرا۔

غالب کے جانے کے بعد محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ چودھویں سے حشمت خاں گانا جاری رکھنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ گاتی ہے مگر اُکھڑے ہوئے سروں میں۔

محفل سے اٹھ کر غالب اپنے مکان کا رخ کرتے ہیں۔ ہوادار گھر کے پاس رکتا ہے۔ غالب اُتر کر دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں، متھراداس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب: اخاہ متھراداس! بھئی تم آج بڑے وقت پر آئے۔ میں تم کو آج بلوانے ہی والا تھا۔

متھراداس: جی روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقط دو قسط آپ نے بھجوائے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے ایک پیسہ آپ نے نہ دیا۔

غالب: لالہ! جس درخت کا پھل کھانا ہوتا ہے، اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں، پانی دو تو پھل پیدا ہو۔

متھراداس: جی دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے۔ کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر ایک دستاویز کر دیں تو آگے کا نام لیں۔

غالب: لو ابھی دستاویز لکھ دیتا ہوں۔ پر ایک شرط یہ ہے کہ دو ہزار روپے ابھی ابھی مجھے اور دو۔

متھراداس: اچھا میں اشٹام منگواتا ہوں۔ بہی ساتھ لایا ہوں۔ آپ منشی غلام عمر عرضی نویس کو بلا لیں۔ پر سود وہی سوا روپیہ سیکڑہ ہو گا۔

غالب: لالہ! کچھ تو انصاف کرو، بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں۔

متھراداس: سرکار! بارہ آنے سود پر بارہ برس میں کوئی مہاجن روپے نہ دے گا۔

روپے قرض لے کر زیورات تیار کرتے ہیں اور نوکر کے ہاتھ چودھویں کو زیورات بھیجتے ہیں۔

یہ مکالمہ سنیے:

چودھویں: کہو میاں مردھے! کہاں سے آئے ہو؟

مداری: حبش خاں کے پھاٹک سے آیا ہوں۔۔۔نواز مرزا اسد اللہ خاں صاحب نے یہ توڑا بھیجا ہے۔۔۔کچھ زیور ہیں۔

چودھویں اشتیاق سے توڑا لیتی ہے "مرزا غالب نے بھیجا ہے؟۔۔۔لاؤ مجھے دو۔"

مداری: بی بی جی! گن کر سنبھال لیجیے۔اور ایک بات جو نواب صاحب نے کہی ہے وہ سن لیجیے۔

چودھویں: (خوش ہو کر) کیا کہا ہے؟ اب بھی کہہ دو۔

مداری: کہا ہے، اپنے جمعدار سے کہنا، جن مقدموں کا فیصلہ روپیہ پیسہ چڑھا کر بڑی آسانی سے اپنے حق میں ہو جائے، ان پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

چودھویں: (پریشان ہو کر کہتی ہے) وہی ہوا جو میں سمجھتی تھی۔۔۔میاں مردھے! تم ذرا ٹھہرو تو میں تم سے کچھ کہوں۔

مداری: بی بی جی! نواب صاحب نے کہا تھا کہ دیکھو مداری! یہ دے آنا، واپس نہ لانا اور فوراً چلے آنا۔

چودھویں: ذرا دم بھر ٹھہرو۔سنو، اُن سے کہنا۔۔۔میں کیوں کر۔۔۔ہاں یہ کہنا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔لیکن سنا تم نے، کہنا، مجبوری سے کہہ گئی۔۔۔نہیں، نہیں۔مردھے بابا! کہنا۔۔۔ہاں کیا۔۔۔بس یہی کہ میرا قصور کچھ نہیں (آنکھوں میں اس کے آنسو آ جاتے ہیں) لیکن سنا مداری! تم اتنا کہنا کہ آپ تشریف لائیں تو میں اپنے دل کا حال کہوں۔۔۔اچھا تو یوں ہی کہنا کہ سب زبانی عرض کروں گی۔۔۔ہائے کیا کہوں۔۔۔سنو میرا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا۔۔۔اور لو یہ دس روپے تمہارا انعام۔

اے میاں مردھے!۔۔۔اے میاں مداری!۔۔۔کہنا، میری جان کی قسم! ضرور آیئے گا۔۔۔کہنا، میرا مردہ دیکھئے۔۔۔چودھویں کو اپنے ہاتھ سے گاڑیئے گا جو نہ آیئے۔۔۔دیکھو ضرور سب کچھ کہنا۔۔۔!

(ماہنامہ "گُلِ خنداں"، لاہور، منٹو نمبر شمارہ ۶/۷، ۱۹۵۵ء)

ooo

غالب اور سرکاری ملازمت

حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان خانے کے متصل یہ جو مسجد کے عقب میں ایک مکان ہے، مرزا کا ہے۔ اسی کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا:

؎ مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے
یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

آیئے آپ کو دیوان خانے میں لے چلیں۔ کوئی حرج نہیں، رات ہے تو کیا، مرزا صاحب کے یہاں یقیناً اس وقت بھی رونق ہوگی۔۔۔۔ رونق تو خیر اتنی نہیں لیکن منشی شونرائن موجود ہیں۔

(مرزا صاحب کاغذ لیتے ہوئے)

منشی شونرائن: تو کیا سچ مچ یہ غزل آپ کی نہیں؟

غالب: (بھنا کر) بھائی حاشاثم حاشا! اگر یہ غزل میری ہو، اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں۔ لاحول ولا۔ اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں۔ لیکن اگر یہ غزل میری ہے تو مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا، قبلہ! آپ نے کیا خوب کہا ہے:

؎ اسد اس جفا پہ بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے اس سے کہا، اگر یہ میرا مطلع ہو تو مجھ پہ ہزار لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میر مانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل انہی کے شاندار کلام کا نمونہ ہے۔

منشی شونرائن! تم طرز تحریر پر بھی غور نہیں کرتے۔
منشی شونرائن: (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس ہے۔
(مرزا غالب کا نوکر کلو داخل ہوتا ہے)۔
کلو: حضور! منشی غلام رسول صاحب آئے ہیں۔
غالب: تشریف لائیں۔ (کلو کمرے سے باہر جاتا ہے اور منشی غلام رسول داخل ہوتے ہیں۔)
غلام رسول: تسلیم بجالاتا ہوں مرزا صاحب!
غالب: تسلیم! کہیے کیونکر آنا ہوا منشی صاحب؟
غلام رسول: مسٹر ٹامسن صاحب سیکرٹری بہادر نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جناب کو کالج میں فارسی کا استاد مقرر کریں۔
منشی شونرائن: مبارک ہو مرزا صاحب!
غالب: بھئی پوری بات تو سن لو۔۔۔ ہاں تو اور کیا منشی صاحب؟
غلام رسول: انہوں نے کل دس بجے آپ کو بلایا ہے۔
غالب: بہتر، میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کیجیے گا اور کہیے گا کہ زہے نصیب آپ نے مجھے منتخب فرمایا ہے۔۔۔ میرا شکریہ قبول ہو۔
غلام رسول: تو میں سیکرٹری صاحب بہادر کی کوٹھی کے بائیں باغ میں حاضر رہوں گا اور جونہی آپ تشریف لائیے گا، فوراً آپ کی تشریف آوری کی خبر دوں گا۔
غالب: آپ کی نوازش ہے، میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔
غلام رسول: (مسکراتے ہوئے) اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔
(منشی غلام رسول کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔)
منشی شونرائن: (مسکراتے ہوئے) اب تو اجازت ہے مبارک باد دینے کی!
غالب: (مسکرا اُٹھتے ہیں) نہیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارک باد لینے دو۔
مرزا غالب زنان خانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بیگم بیٹھی وضو کر رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی انہوں نے منہ سجا لیے اور کہنا شروع کیا۔
امراؤ بیگم: آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے میری چند

باتیں سن لیجیے۔ پر آپ کو فرصت کہاں!

غالب: (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صاحبہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ مہین مہین چٹکیاں لے کر نصیحتیں یا فضیحتیں کیجیے گا۔ خیر فرمائیے۔

امراؤ بیگم: (چڑ کر) دیکھئے پھر آپ نے طعن طروز کی باتیں شروع کر دیں۔

غالب: (زیر لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہئے۔

امراؤ بیگم: میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر گزران ہوگی۔ کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ قرض کس صورت ادا ہوگا۔ اے قرض جائے جہنم میں، روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے۔ اب تو لتے بدن پر جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

غالب: (پُراسرار طریقے سے مسکراتے ہوئے) آپ گھبرائیے مت، خدا نے سن لی ہے۔ (چوکی پر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے۔)

امراؤ بیگم: کیا سن لی ہے خدا نے؟

غالب: (فاتحانہ انداز میں) آپ کے وظیفوں کی برکت سے مسٹر ٹامسن بہادر نے مجھے بلایا ہے۔ کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی ایک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ بیگم: اپنے منہ میاں مٹھو!

غالب: جی سن تو لیجیے۔ کم سے کم۔۔۔ کم سے کم۔۔۔ کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو میرا مقرر ہو ہی جائے گا۔ لیجیے اب خوش ہوئیں۔

امراؤ بیگم: (لوٹا لے کر اٹھتے ہوئے) ہوگئی۔

غالب: تو ذرا ہنس دیجیے۔

امراؤ بیگم: چونچلے نہ بگھاریئے۔

غالب: (خوش طبعی سے) نہیں میری جان کی قسم ہنسو، تاکہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

(امراؤ بیگم کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)۔

غالب: (اطمینان کے ساتھ) خدا میری بیگم کو ہنستا ہی رکھے بھئی امراؤ بیگم! تم غالب کی روح رواں ہو۔

امراؤ بیگم: اب اپنی شاعری رہنے دیجیے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجیے۔

دوسرے روز صبح کو مرزا غالب مسٹر ٹامسن سے ملاقات کرنے کے لیے تیار ہونے لگے۔

غالب: (مضطرب حالت میں) کیوں میاں مداری! یہ کلّو داروغہ کہاں گئے؟

مداری: جی ابھی تو یہیں تھے حضور۔ شاید معظم علی عطر فروش کی دکان پر بیٹھے ہوں گے۔

غالب: ذرا بلانا، مجھے سکتر بہادر کے ہاں جانا ہے۔ میرے درباری کپڑے نکال دیں۔

مداری: (قدموں کی چاپ سن کر) لیجیے کلّو داروغہ آ گئے۔ (کلّو داخل ہوتا ہے۔)

کلّو: آپ نے مجھے یاد فرمایا؟

غالب: بھئی کلّو! تم کہاں دن بھر غائب رہتے ہو؟

کلّو: کیا حکم ہے سرکار؟

غالب: ذرا میرے درباری کپڑے نکالو، مجھے آج دس بجے سیکرٹری صاحب بہادر کے ہاں جانا ہے۔

کلّو: (جاکر پلٹتے ہوئے) کیوں سرکار؟ وہ شالی چوغہ اور دستار ضرور نکالی جائے گی۔ جوڑا کون سا نکالا جائے؟

غالب: وہ ٹانڈے کی جامدانی کا انگرکھا، یا وہ ریشمی دھاری دار قدکار اور جوتا وہی سلیم شاہی جو آٹھ روز ہوئے میں نے خریدا ہے۔۔۔ ہاں اور شالی رومال بھی نکال لینا۔

درباری کپڑے پہن کر مرزا غالب تیار ہوئے اور ہوادار میں سیکرٹری صاحب بہادر کی کوٹھی پر پہنچے۔ منشی غلام رسول پائیں باغ میں پونے دس بجے سے ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جونہی کہاروں نے ہوادار کندھوں سے اتارا، منشی غلام رسول مسٹر ٹامسن بہادر کو خبر دینے کے لیے کوٹھی کے اندر داخل ہوئے۔

غلام رسول: سرکار! مرزا غالب سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں، حسب الحکم میں حاضر ہوں۔

ٹامسن: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت پابندیٔ وقت سے تشریف لائے۔ اچھا سلام دو اور کہو تشریف لائیں۔

منشی غلام رسول باہر آئے۔ غالب چہل قدمی کر رہے تھے۔

غلام رسول: حضور! تشریف لے چلئے۔ صاحب یاد فرماتے ہیں۔

غالب: (حیرت سے) کیا کہا؟

غلام رسول: آپ کو بلایا ہے حضور!

غالب: بلایا ہے؟ دستور کے موافق صاحب سکتر بہادر مجھ ناچیز کو لینے آئیں تو میں چلا چلوں گا۔
غلام رسول: بہتر جناب! میں جا کر عرض کرتا ہوں۔
منشی غلام رسول ایک بار پھر اندر آ گئے اور مسٹر ٹامسن سے کہا۔
غلام رسول: حضور! وہ فرماتے ہیں کہ حسب دستور میرے لینے کو آئیں تو میں چلوں۔
ٹامسن: (مسکرا کر) بڑے بگڑے دل و دماغ دار معلوم ہوتے ہیں۔ چلو میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔
مسٹر ٹامسن کوٹھی سے باہر نکلے اور مرزا غالب سے مصافحہ کیا۔
ٹامسن: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب!
غالب: کورنش بجا لاتا ہوں۔
ٹامسن: آپ اندر تشریف کیوں نہیں لائے؟
غالب: دستور کے موافق آپ مجھ ناچیز کو لینے آتے، میں حاضر ہوتا۔
ٹامسن: (مسکرا کر) مرزا صاحب! جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔
غالب: قبلہ! گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ کر کے حاضر ہوا ہوں اور یہ امید تھی کہ اس ملازمت سے کچھ عزت زیادہ ہو جائے گی۔ نہ اس لیے کہ رہی سہی عزت میں فرق آئے۔
ٹامسن: میں قاعدے سے مجبور ہوں۔
غالب: (ہوادار کی طرف جاتے ہوئے) تو مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ تسلیم عرض ہے۔
ٹامسن: تشریف لے جایئے گا۔۔۔؟
غالب ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہاروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں، گھر کے باہر اپاہجوں اور بھکاریوں کا ہجوم جمع ہے اور بی رحمین ان میں خیرات بانٹ رہی ہیں۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا کہ تخت پر امراؤ بیگم دوگانہ ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔
امراؤ بیگم: الحمدللہ! کہیے خدا کا فضل ہو گیا؟

غالب: (تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں ہو گیا۔

امراؤ بیگم: کیا مطلب؟

غالب: مطلب یہ کہ رہی سہی عزت مٹی میں ملنے سے بچ گئی۔

امراؤ بیگم: ہائیں۔۔۔یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

غالب: (اُٹھ کر تمکنت کے ساتھ) بیگم! عزت و ناموس کے لیے ہم مغل بچے مرمٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمت سرکاری سے کچھ عزت میں اضافہ ہو جائے گا، مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر نہ آئے۔ بھلا سوچو، مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہو سکتی ہے؟

ع بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

مگر میں پوچھتا ہوں یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے؟

امراؤ بیگم: (فکر مند ہو کر) کچھ نہیں۔

غالب: کچھ نہیں کیا۔ تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں، کب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر گزران ہوگی۔ (امراؤ بیگم مسکرا دیتی ہے۔)

غالب: ارے بھئی! کچھ بتاؤ تو؟

امراؤ بیگم: کیا بتاؤں؟ کل میں نے اپنا جڑاؤ گلوبند بی رحمین سے گراؤ رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے۔ شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سن کر در پر یہ بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی رحمین سے کہا، جاؤان کا سر صدقہ دے آؤ۔

غالب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ امراؤ بیگم گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

(تلخ، ترش اور شیریں)

ooo

قرض کی پیتے تھے۔۔۔

ایک جگہ محفل جمی تھی۔ مرزا غالب وہاں سے اُکتا کر اُٹھے۔ باہر ہوادار موجود تھا، اس میں بیٹھے اور اپنے گھر کا رُخ کیا۔ ہوادار سے اُتر کر جب دیوان خانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ متھرا داس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب نے اندر داخل ہوتے ہی کہا "اخاہ متھرا داس! ۔۔۔ بھئی تم آج بڑے وقت پر آئے، میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔"

متھرا داس نے ٹھیٹ مہاجنوں کے سے انداز میں کہا "حضور! روپوں کو بہت دن ہو گئے، فقط دو قسط آپ نے بھجوائے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے، ایک پیسہ بھی آپ نے نہ دیا۔"

اسد اللہ خان غالب مسکرائے "بھئی متھرا داس! دینے کو میں سب دے دوں گا، گلے گلے پانی دوں گا۔ وہ ایک جائیداد میری باقی ہے۔"

"اجی سرکار! ۔۔۔ اس طرح بیوپار ہو چکا۔۔۔ نہ اصل میں نہ سود میں سے پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نہیں ہوا۔ چھ سوچھپن سود کے ہو گئے۔"

مرزا غالب نے حقّے کی نے پکڑ کر ایک کش لیا "لالہ! جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں، پانی دو تو اناج پیدا ہو۔"

متھرا داس نے اپنی دھوتی ٹھیک کی۔۔۔ "جی دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے ہیں، کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر دستاویز بنا دیں تو آگے کا نام لیں۔"

مرزا غالب نے حقے کی نے ایک طرف کی ''لو ابھی دستاویز لکھے دیتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ دو ہزار ابھی ابھی مجھے ادا دو۔''

متھرا داس نے تھوڑی دیر غور کیا۔ ''اچھا، میں اسٹام منگواتا ہوں، بہی ساتھ لایا ہوں۔ آپ منشی غلام رسول عرضی نویس کو بلالیں۔ پر سود دو ہی سوا دو پیسے سیکڑہ ہوگا۔''

متھرا داس نے اپنی دھوتی کی لانگ دوسری بار درست کی۔ ''سرکار! بارہ آنے پر بارہ برس بھی کوئی مہاجن قرض نہیں دے گا۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔''

ان دنوں واقعی بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو اپنے اخراجات کے لیے روپے پیسے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔

بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھا لیکن مرزا غالب شاعر تھے۔ گو وہ اپنے شعروں میں اپنا رشتہ سپاہ گری سے جوڑتے تھے۔

یہ مرزا صاحب کے چالیسویں پینتالیسویں سال کے درمیانی عرصے کی بات ہے جب متھرا داس مہاجن نے ان پر عدم ادائیگی کے باعث دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ مقدمے کی سماعت مرزا صاحب کے مربی اور دوست مفتی صدر الدین آزردہ کو کرنا تھی جو خود بہت اچھے شاعر اور غالب کے مداح تھے۔

مفتی صاحب کے مردھانے عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر آواز دی ''لالہ متھرا داس مہاجن اور مرزا اسد اللہ خان غالب مدعا علیہ حاضر ہوں۔''

متھرا داس نے مرزا غالب کی طرف دیکھا اور مردھے سے کہا ''ابھی دونوں حاضر ہیں۔'' مردھے نے روکھے پن سے کہا ''تو دونوں حاضر عدالت ہوں۔''

مرزا غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر مفتی صدر الدین آزردہ کو سلام کیا۔ مفتی صاحب مسکرائے۔

''مرزا نوشہ! یہ آپ اس قدر قرض کیوں لیا کرتے ہیں؟ آخر معاملہ کیا ہے؟''

غالب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ''کیا عرض کروں۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔''

مفتی صدر الدین مسکرائے۔ ''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔''

غالب نے برجستہ کہا ''ایک شعر موزوں ہو گیا ہے مفتی صاحب! حکم ہو تو جواب میں عرض

کروں۔"

غالب نے مفتی صاحب اور متھرا داس مہاجن کو ایک لمحہ کے لیے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

مفتی صاحب بے اختیار ہنس پڑے "خوب خوب!۔۔۔کیوں صاحب رسّی جل گئی پر بل نہ گیا۔ آپ کے اس شعر کی میں تو ضرور داد دوں گا۔ مگر آپ کو اصل سود سب سے اقرار ہے، عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دیے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

مرزا غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "مدعی سچا ہے تو کیوں فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو، اور میں نے بھی یہی بات نثر میں نہ کہی نظم میں کہہ دی۔"

مفتی صدرالدین آزردہ نے کاغذاتِ قانون ایک طرف رکھے اور مرزا غالب سے مخاطب ہوئے۔ اچھا تو زرِ ڈگری میں ادا کردوں گا کہ ہماری آپ کی دوستی کی لاج رہ جائے۔"

مرزا غالب بڑے خوددار تھے، انہوں نے مفتی صاحب سے کہا "حضور! ایسا نہیں ہو گا۔۔۔متھرا داس کا روپیہ دینا ہے۔۔۔ میں بہت جلد ادا کر دوں گا" مفتی صاحب بولے "مجھے آج موقعہ دیجیے کہ آپ کی کوئی خدمت کرسکوں۔"

غالب خفیف ہوئے "لاحول ولا۔۔۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔۔۔ مجھے کوئی سزا دیجیے کہ آپ صدر الصدور ہیں۔۔۔"

"دیکھو تم ایسی باتیں مت کرو۔"

"تو اور کیسی باتیں کروں۔"

"کوئی شعر سنایئے۔"

"سوچتا ہوں۔۔۔ ہاں ایک شعر رات کو ہو گیا تھا۔ عرض کیے دیتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

ہم اور وہ سبب رنج آشنا دشمن

مفتی صاحب نے اپنے قانونی قلم سے قانونی کاغذ پر یہ حروف لکھے:

ع ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے

مفتی صاحب بڑے محظوظ ہوئے۔ یہ شعر آسانی سے سمجھ میں آ سکنے والا نہیں لیکن وہ چونکہ خود بہت بڑے شاعر تھے اس لیے غالب کی دقیقہ بیانی کو فوراً سمجھ گئے۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت ہوئی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے مرزا غالب سے کہا:

''آپ آئندہ قرض کی نہ پیا کریں۔''

غالب جو شاید کسی شعر کی فکر کر رہے تھے، کہا'' ایک شعر ہو گیا، اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔''

مفتی صاحب نے کہا'' فرمائیے! فرمائیے!''

مرزا غالب کچھ دیر خاموش رہے۔ غالباً ان کو اس بات سے بہت کوفت ہوئی تھی کہ مفتی صاحب ان پر احسان کر رہے ہیں۔

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا'' حضرت! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟''

''جی کوئی خاص بات نہیں۔''

ے ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

''آپ کو باتیں کرنا تو ماشاءاللہ آتی ہیں۔''

غالب نے جواب دیا'' جی ہاں۔۔۔ لیکن بنانا نہیں آتیں۔''

مفتی صدر الدین مسکرائے'' اب آپ جا سکتے ہیں۔ زرِ ڈگری میں ادا کر دوں گا۔''

مرزا غالب نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا'' آج آپ نے دوستی کے تمسک پر مہر لگا دی۔ جب تک زندہ ہوں۔۔۔ بندہ ہوں۔''

مفتی صدر الدین آزردہ نے ان سے کہا'' آپ تشریف لے جائیے۔ پر خیال رہے کہ روز روز ڈگری میں ادا نہیں کر سکتا۔ آئندہ احتیاط رہے۔''

مرزا غالب تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں غرق ہو گئے۔

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا'' کیا سوچ رہے ہیں آپ۔۔۔؟''

مرزا چونک کر بولے'' جی میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ شاید کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ:

؎ موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!''

مفتی صاحب نے ان سے پوچھا ''آپ کو رات بھر نیند نہیں آتی؟''

مرزا غالب نے مسکرا کر کہا ''کسی خوش نصیب کو ہی آتی ہوگی۔''

مفتی صاحب نے کہا ''آپ شاعری چھوڑیئے۔ بس آئندہ احتیاط رہے۔''

مرزا صاحب انگر کھے کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولے ''آپ کی نصیحت پر چل کر ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کروں گا۔ مفتی صاحب مفت کی زحمت آپ کو ہوئی نقد اسوائے شکریے کے اور کیا ادا کر سکتا ہوں۔ خیر خدا آپ کو دس گنا دنیا میں ستر گنا آخر میں دے گا''

یہ سن کر مفتی صدرالدین آزردہ زیر لب مسکرائے ''آخرت والے میں تو آپ کو شریک کرنا محال ہے۔ دنیا کے دس گنے میں بھی آپ کو ایک کوڑی نہیں دوں گا کہ آپ مے خواری کیجیے۔''

مرزا غالب ہنسے۔۔۔ ''میخواری کیسی مفتی صاحب!''

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اور یہ شعر سنا کر مرزا غالب عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

(بُرقعے)

ooo

مرزا غالب کی حشمت خاں کے گھر دعوت

جب حشمت خاں کو معلوم ہو گیا کہ چودھویں (ڈومنی) اس کے بجائے مرزا غالب کی محبت کا دَم بھرتی ہے، حالانکہ وہ اس کی ماں کو ہر مہینے کافی روپے دیتا ہے اور قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ اس کی مسی کی رسم بہت جلد بڑے اہتمام سے ادا کر دی جائے گی تو اس کو بڑا تاؤ آیا۔ اس نے سوچا کہ مرزا نوشہ کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کرنا چاہیے، چنانچہ ایک دن مرزا کو رات کو اپنے یہاں مدعو کیا۔

مرزا غالب وقت کے بڑے پابند تھے، جب حشمت خاں پہنچے تو دیکھا کہ گنتی کے چند آدمی جھولداری کے نیچے شمعوں کی رَسن میں بیٹھے ہیں۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ اُگلدان جا بجا قالینوں پر پڑے ہیں۔

غالب آئے، تعظیماً سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن سے معانقہ کیا۔ وہ حشمت خاں سے مخاطب ہوئے ''ہائیں۔۔۔خاں صاحب یہاں تو سناٹا پڑا ہے۔۔۔ابھی کوئی نہیں آیا؟''

حشمت خاں مسکرایا ''یوں کیوں نہیں کہتے کہ اندھیرا پڑا ہے۔۔۔ چودھویں آئے تو چاندنی چھٹک جائے۔''

مرزا غالب نے یہ چوٹ بڑے تحمل سے برداشت کی ''سچ تو یوں ہے کہ آپ کے گھر میں چودھویں کے دَم سے روشنی ہے۔ ہتھکڑیوں کی جھنکار اور آپ کی تیز گفتار کے سوا یہاں دھرا ہی کیا ہے؟''

حشمت خاں کھسیانا سا ہو گیا۔۔۔اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اتنے میں دو تین اصحاب اندر

داخل ہوئے جن کو حشمت خاں نے مدعو کیا تھا۔ ''آگے آیئے جناب جمیل احمد خاں صاحب۔۔۔ آیئے۔ اور بھئی سرور خاں! تم نے بھی حد کردی۔''

حشمت خاں کے مہمانوں نے، جو اس کے دوست تھے، موزوں و مناسب الفاظ میں معذرت چاہی اور چاندنی پر بیٹھ گئے۔

''بی چودھویں ابھی تک نہیں آئیں۔۔۔ کیا وجہ؟''

منے خان نے عرض کی ''جی حضور بہت دیر سے آئی لال کمرے میں بیٹھی ہیں۔۔۔ سارے ساجی حاضر ہیں۔۔۔ کیا حکم ہے؟''

حشمت خاں نے طشتری میں سے پان کا چاندی اور سونے کے ورق لگا ہوا بیڑا اُٹھایا اور اپنے نوکر کو دیا ''لو یہ بیڑا دے دو۔۔۔ محفل میں آجائیں، گانا اور ناچ شروع ہو۔''

منے خان لال کمرے میں گیا۔ چودھویں چوڑی دار پائجامہ پہنے دونوں ٹخنوں پر گھنگرو باندھے تیار بیٹھی تھی۔ اس نے اس سانولی سلونی جوانی کو بیڑا دیا۔ چودھویں نے اسے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھی، دونوں پاؤں فرش پر مار کر گھنگروؤں کی نشست دیکھی اور سا جیوں سے کہا ''تم لوگ چلو اور لہرا بجانا شروع کرو۔۔۔ میں آئی۔''

ساجیوں نے حاضرین کو فرشی سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ طبلہ سارنگی سے ملنے لگا، لہرا بجانا شروع ہوا ہی تھا کہ چودھویں لال کمرے ہی سے ناچتی تھرکتی محفل میں آئی۔ کورنش بجالا کر ایک چھناکے کے ساتھ ناچنے لگی۔ جمیل احمد نے تو ایک توڑے پر بے اختیار کہا ''بی چودھویں! کیا کیا ناچ کے انگوں میں بھاؤ لجاؤ بتا رہی ہو؟'' چودھویں نے، جو کہ ایک نیا توڑا لے رہی تھی، اسے ختم کر کے تسلیم بجالاتے ہوئے کہا ''حضور! آپ رئیس لوگ قدر دانی فرماتے ہیں، ورنہ ناچنا کیا جانوں۔''

سردار خان بہت مسرور تھے، کہا ''سچ تو یہ ہے بی چودھویں! تم ناچتی ہو تو معلوم ہوتا ہے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔''

جمیل احمد سرور خاں سے مخاطب ہوئے ''اماں گل ریز نہیں کہتے۔'' پھر انہوں نے غالب کی طرف دیکھا ''کیوں مرزا نوشہ!۔۔۔ صحیح عرض کر رہا ہوں نا؟''

غالب نے تھوڑے سے توقف کے بعد چودھویں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا ''میں تو نہ پھلجھڑی کہوں گا اور نہ گل ریز۔۔۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ معلوم ہوتا ہے مہتاب چھوٹ رہی ہے۔''

جمیل احمد بولے ''واہ دا! کیوں نہ ہو، شاعر ہیں، چودھویں کا ناچ اور مہتاب، نہ پھلجھڑی نہ گل ریز، سبحان اللہ! سبحان اللہ!''

حشمت خاں نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا ''ایک تو یوں ان بی صاحبہ کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے، آپ لوگ اور ساتویں آسمان پر پہنچا رہے ہیں۔''

چودھویں ناچتے ہوئے ایک ادا سے حشمت خاں کو کہتی ہے ''جی ہاں آپ کو تو بس کیڑے ڈالنے آتے ہیں۔''

حشمت خاں مسکراتا ہے اور اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا ہے۔ ''اچھا حضرات! سنئے۔ چودھویں جس وقت ناچتی ہے معلوم دیتا ہے پانی پر مچھلی تیر رہی ہے'' پھر چودھویں سے مخاطب ہوئے ''لو اب خوش ہوئیں۔''

چودھویں ناچنا بند کر دیتی ہے اور ننھی سی ناک چڑھا کر کہتی ہے ''دماغ کہاں پہنچا ہے۔ سڑی بدبودار مچھلی۔۔۔ ڈور پار۔۔۔ نوج میں کیا مچھلی ہوں۔''

محفل میں فرمائشی قہقہے لگتے ہیں۔ حشمت خاں کو چودھویں کا جواب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔۔۔ مگر چودھویں ان کے بگڑے ہوئے تیوروں کی کوئی پروا نہیں کرتی اور غالب کو محبت کی نظر سے دیکھ کر اُن کی یہ غزل بڑے جذبے سے گانا شروع کرتی ہے:

یہ جو ہم ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

چودھویں یہ غزل غالب کی طرف رُخ کر کے گاتی ہے اور کبھی کبھی مسکرا دیتی ہے۔۔۔ غالب بھی متبسم ہو جاتے ہیں۔ حشمت خاں جل بھن جاتا ہے اور چودھویں سے بڑے کڑے لہجے میں کہتا ہے ''ارے ہٹاؤ یہ غزلیں وزلیں، کوئی ٹھمری دادرا گاؤ۔''

چودھویں گانا بند کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کی طرف تھوڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہے اور یہ ٹھمری الاپنا شروع کرتی ہے:

پیا بن ناآوت چین

حشمت خاں کے سارے منصوبے خاک میں ملے جا رہے تھے۔ اپنی کرخت آواز میں جان محمد کو بلاتا اور اس سے کہتا ہے "وہ میرا صندوقچہ لانا۔"

جان محمد بڑے ادب سے دریافت کرتا ہے "کون سا صندوقچہ حضور؟"

"ارے وہی جس میں کل میں نے تمہارے سامنے کچھ زیورات لا کے رکھے ہیں۔"

گانا جاری رہتا ہے۔۔۔ اس دوران میں جان محمد صندوقچہ لا کر حشمت خاں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ غالب کو، جو چودھویں کا گانا سننے میں محو ہے، ایک نظر دیکھ کر مسکراتا ہے۔ صندوقچہ کھول کر ایک جڑاؤ گلوبند نکال کر چودھویں سے مخاطب ہوتا ہے "چودھویں! یہ۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ یہ گلوبند کس کا ہے؟"

چودھویں ایک ادا کے ساتھ جواب دیتی ہے "میرا!"

حشمت خاں غالب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہے اور صندوقچے سے جڑاؤ جھالے نکال کر چودھویں سے پوچھتا ہے "اچھا یہ جھالے کس کے؟"

پھر وہی ادا، پر اب تصنع اختیار کر رہی تھی "میرے!"

حاضرین یہ تماشا دیکھ رہے تھے، جن میں مرزا غالب بھی شامل تھے۔ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

حشمت خاں اب کے کڑے نکالتا ہے "چودھویں! یہ کڑوں کی جوڑی کس کی؟"

چودھویں کی ادا بالکل بناوٹی ہو گئی "میری!"

اب حشمت خاں بڑی خود اعتمادی سے اس سے سوال کرتا ہے "اچھا یہ بتاؤ، یہ چودھویں کس کی؟"

چودھویں توقف کے بعد ذرا آنچل کی آڑ لے کر دیکھتی ہے "آپ کی!"

غالب خاموش رہتے ہیں، لیکن حشمت خاں نے، جو شاید چودھویں کے آنچل کی اوٹ کا جواب سمجھ نہیں سکا تھا، مرزا سے کہا "آپ بھی گواہ رہیے گا۔"

غالب نے ذرا تیکھے پن سے جواب دیا "سازشی مقدمے میں گواہی مجھ سے دلواتے ہو۔"

"تم نے نہیں سنا؟"

مرزا غالب محفل سے اٹھ کر جاتے ہوئے حشمت خاں سے کہتے ہیں "کچھ دیکھا نہ کچھ سنا۔۔۔ اور دوسرے مجھی سے مقدمہ اور مجھی سے گواہی، غضب اندھیرا۔"

غالب کے جانے کے بعد محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔۔۔ چودھویں سے حشمت خاں گانا

جاری رکھنے کے لیے کہتا ہے۔۔۔صرف حکم کی تعمیل کے لیے وہ گاتی ہے، مگر اُکھڑے ہوئے سُر دں میں۔ حشمت خاں دلی طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ شکست خوردہ ہے، آج کا میدان غالب مار گئے۔

دوسرے دن غالب کا بھیجا ہوا آدمی مداری چودھویں کے گھر پہنچتا ہے اور چودھویں سے ملتا ہے۔۔۔وہ اس کو پہچانتی تھی، اس لیے بہت خوش ہوتی ہے اور اس سے پوچھتی ہے ''میاں مداری! کہاں سے آئے ہو؟''

''جی حبش خاں کے پھاٹک سے آیا ہوں۔۔۔نواب مرزا اسد اللہ خان صاحب نے بھیجا ہے۔''

چودھویں کا دل دھڑ کنے لگا''کیوں، کیا بات ہے؟''

''جی انہوں نے یہ توڑا بھیجا ہے۔'' یہ کہہ کر مداری توڑا چودھویں کو دیتا ہے جسے وہ جلدی جلدی بڑے اشتیاق سے کھولتی ہے۔اس میں سے زیورات نکلتے ہیں۔

مداری: ''بی بی جی! گن کے سنبھال لیجیے۔ اور ایک بات جو نواب صاحب نے کہی ہے، وہ سن لیجیے!''

''کیا ہے؟''

مداری تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد زبان کھولتا ہے۔۔۔''انہوں نے کہا تھا۔۔۔اپنے رئیس جمعدار حشمت خاں سے کہنا کہ جن مقدموں کا فیصلہ روپیہ پیسا چڑھا کر بڑی آسانی سے اپنے حق میں ہو جائے، ان پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔''

چودھویں گزشتہ رات کے واقعات کی روشنی میں مرزا نوشہ کی اس بات کو فوراً سمجھ جاتی ہے اور دانتوں سے اپنی مخروطی انگلیوں کے ناخن کاٹنا شروع کر دیتی ہے اور سخت پریشان ہو کر کہتی ہے ''وہی ہوا جو میں سمجھتی تھی۔۔۔میاں مداری! تم ذرا ٹھہرو تو میں تم سے کچھ کہوں۔''

مداری چند لحات سوچتا ہے۔''لیکن بی بی جی! نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ دیکھو مداری! یہ توڑا دے آنا، واپس نہ لانا، فوراً چلے آنا۔''

چودھویں اور زیادہ مضطرب ہو جاتی ہے''ذرا دم بھر ٹھہرو۔۔۔سنو، ان سے کہنا۔۔۔میں کیوں کر۔۔۔ہاں یہ کہنا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔لیکن سنا تم نے۔۔۔کہنا، مجبوری سے کہہ گئی۔ نہیں نہیں مردے بابا کہنا۔ ہاں کیا؟۔۔۔بس یہی کہ میرا قصور کچھ نہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔''لیکن سنا میاں مداری!۔۔۔تم اتنا ضرور کہنا کہ آپ خود تشریف لائیں تو میں

اپنے دل کا حال کہوں ۔۔۔اچھا تو یوں کہنا ۔۔۔زبانی عرض کروں گی ۔۔۔ہائے اور کیا کہوں ۔۔۔سنو میرا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا۔‘‘

مداری ’’اچھا، اچھا‘‘ کہتا چلا جاتا ہے۔لیکن چودھویں اسے اپنی آنسو سے بھری آنکھوں سے سیڑھیوں کے پاس ہی روک لیتی ہے ’’اے میاں مرد ھے!۔۔۔اے میاں مداری!۔۔۔کہنا، میری جان کی قسم ضرور آئیے گا۔۔۔دیکھو ضرور سب کچھ کہنا۔۔۔‘‘

مداری چلا جاتا ہے۔وہ روتی روتی بیٹھک میں آتی ہے اور گاؤ تکیے پر گر کر آنسو بہانے لگتی ہے۔تھوڑی دیر کے بعد جمعدار حشمت خاں آتا ہے اور معنی خیز نظروں سے اس کو دیکھتا ہے۔چودھویں کو اُس کی آمد کا کچھ احساس نہیں ہوتا اس لیے کہ۔۔۔ایک اتھاہ سمندر میں تھپیڑے کھا رہی تھی حشمت خاں اس کے پاس ہی مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔۔۔پھر بھی چودھویں کو اس کی موجودگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔۔۔بے خودی کے عالم میں وہ اس کی طرف بالکل خالی نظروں سے دیکھتی ہے اور بڑبڑاتی ہے ’’جانے وہ ان سے سب باتیں کہے گا بھی یا نہیں۔‘‘

حشمت خاں، جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، کرخت آواز میں بولا ’’میری جان! مجھ سے کہی ہوتیں تو ایک ایک تمہارے مرزا نوشہ تک پہنچا دیتا۔‘‘

چودھویں چونک پڑتی ہے، جیسے اس کے خوابوں کی دنیا میں کسی نے ایک دم جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔۔۔اس کی آنسو بھری آنکھیں دھندلی ہو رہی تھیں۔اسے صرف سیاہ نوکیلی مونچھیں دکھائی دیں جن کا ایک ایک بال اس کے دل میں تکون کی طرح چبھتا گیا۔آخر اسے کوئی ہوش نہ رہا۔وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی ایک چلتر ہے جو عام طور پر طوائفوں اور ڈومنیوں سے منسوب ہے۔وہ زور زور سے قہقہے لگاتا رہا اور ڈومنی بے ہوشی کے عالم میں مرزا نوشہ کی خاطر مدارات میں فوراً مشغول ہو گئی تھی، اس لیے کہ وہ اس کے بلانے پر آ گئے تھے۔

(شکاری عورتیں)

○○○

حصّہ دوم

پرویز انجم

منٹو کی تحریر کردہ فلم ''مرزا غالب''

افسانہ نویسی اور فلم نویسی سعادت حسن منٹو کی زندگی میں پہلو بہ پہلو چلتی رہی۔ منٹو نے لگ بھگ گیارہ سال، فلم انڈسٹری کے چمکتے دمکتے ایوانوں میں گزارے اور وہاں کے اندرون کو خوب دیکھا اور سمجھا۔ ادب اور فلم منٹو کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ قیامِ بمبئی کے دوران چار پانچ سال تک نیم فلمی و ادبی رسالے ''مصور ویکلی'' سے بطور مدیر منسلک رہے جہاں وہ تنقیدی مضامین اور فلموں پر ریویو وغیرہ لکھتے رہے۔ اِس طرح منٹو ادب کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار کے ہُنر کو فن کی حدود کے باہر بھی استعمال کرتے رہے۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری کے لیے انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور Scanario لکھے۔۔۔ ''مرزا غالب'' اس فلمی کہانی پر منٹو نے اکتوبر ۱۹۴۱ میں اپنے قیامِ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دِلّی کے دوران کام شروع کیا تھا۔ یہ کہانی انہوں نے بہت تحقیق اور کاوش کے بعد لکھی۔ اِس کی تشکیل پر انہوں نے بہت عرق ریزی کی تا کہ اُس زمانے کی تہذیب و معاشرت میں حقیقی عنصر نظر آئے۔ تخلیقی حوالے سے فلم کے میڈیم میں منٹو کا یہ سب سے اعلیٰ اور اہم کام ہے۔ منٹو کو غالب سے بے حد عقیدت تھی۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ''عظیم شاعر غالب کی شخصیت میں ایک ایسا Down to earth مزاج ہے جو ہر انسان کو غالب کے ساتھ Identify کرا دیتا ہے۔'' گو شعر و شاعری سے منٹو کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا مگر غالب کے وہ عاشق تھے۔

غالب، اُردو ادب کی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے، جس نے ہر موضوع پر اپنی ہنر مندی، تخلیق اور صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ہمارے اُردو ادب کی تاریخ ہمیشہ غالب جیسی عظیم شخصیت پر فخر کرتی

رہے گی۔ پروفیسر جی ایم اثر، جو منٹو کے دوست بھی تھے، اُن کا قیاس ہے کہ منٹو غالب کے خطوط کے ذریعے غالب تک پہنچا، کیونکہ منٹو کو شاعری سے اتنی دلچسپی نہیں تھی اور پھر کلام غالب میں فارسی تراکیب نے بھی مشکل پیدا کی ہو گی۔ لہٰذا خطوطِ غالب کے مطالعہ نے ہی ''منٹو کو غالب کے کلام میں دلچسپی کی ترغیب دی ہو گی۔'' بے شک دونوں کی ادبی سمتیں الگ الگ تھیں لیکن مرزا غالب کی شخصیت منٹو کے لیے ہمیشہ جاذب رہی۔ غالب کی نثر میں جو پہلوداری، نکتہ رسی اور مزاج کی رنگارنگی ہے، اس سے منٹو نے بہت استفادہ کیا۔

منٹو جیسے ذہنی سطح کے ادیب کے لیے تاریخ کے ورق کی کوئی ایک لائن، ایک فلیش کی مانند اُن کے ذہن کے کچھ حصے روشن کر دیتی ہے۔ ان پر پھر وہ پوری عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ خطوطِ غالب کے مطالعہ سے ذرہ سا فقرہ اخذ کر کے منٹو اپنے تحریر کردہ ایک مضمون ''غالب اور چودھویں'' میں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ رومان کی ازلی تکون تو ''ستم پیشہ ڈومنی'' اور ''کوتوال دشمن تھا'' کے مختصر الفاظ ہی مکمل کر دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر برج پریمی اس اقتباس کو فلمی کہانی ''مرزا غالب'' لکھنے کا محرک و مرکز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان ہی اشاروں پر منٹو نے اپنا ایک مضمون تیار کر لیا ہے۔ یہی مضمون دراصل فلم مرزا غالب کی بھی بنیاد ہے۔'' (''منٹو کتھا''، ویپ پبلی کیشنز، جموں، ۱۹۹۴ء، ص ۹۹)

منٹو ایک ہنرمند حقیقی فنکار تھے۔ انہوں نے تاریخ میں گم گشتہ مرزا غالب کی زندگی کے اِس قصّے ''ستم پیشہ ڈومنی'' اور ''کوتوال دشمن تھا'' کو بہت چابکدستی اور انتہائی خوبصورتی سے رقم کیا ہے۔ اصل میں فلمی کہانی کار اور تاریخ دان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تاریخ کا بنیادی مقصد معلومات مہیا کرنا ہے جبکہ فلم کا بنیادی مقصد حظ ہے۔ ایسی صورت میں دونوں کے طریقہ ہائے کار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تاریخ کی ضخیم سے ضخیم کتاب بھی وہ معلومات مہیا نہیں کرتی جو ایک فلم کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جہاں تاریخ نگار واقعات کے اہم موڑ اور اہم پہلوؤں تک محدود رہتا ہے وہاں فلمی کہانی نگار کسی تاریخی موضوع پر لکھتے ہوئے ان سارے واقعات سے ایک واقعے کو منتخب کر لیتا ہے اور اسے محدّب عدسے سے دیکھ کر بیان کرتا ہے۔ فلمی کہانی کار ان واقعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں تاریخ دان کی طرح مقید نہیں کہ وہ منطقی اعتبار سے ان واقعات کو بیان کرے۔ مثلاً فلمی کہانی کار ایک ریلوے قلی کو منتخب کر سکتا ہے کہ اُس کی ذات کے حوالے سے پوری عالمی جنگ کو بیان

کردے۔ تاریخی سلسلوں میں تخیّل کو بے لگام چھوڑا جاسکتا ہے۔ فلمی تاریخ نگار کی اپروچ عمومی تاریخ نگار کی نسبت زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور پھر فلمی تاریخی کہانی کار ایک عام روایتی تاریخ دان کی نسبت وسیع ترکینوس اور مخصوص آزادیوں کا مالک ہوتا ہے جن کی بدولت وہ کسی دور کی تاریخ کو اپنے جذباتی حوالوں سے دیکھ کر تاریخ دان کی نسبت ایک بہتر امپیکٹ بنا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں فلمی کہانی کار کے پاس بڑا وسیع میدان ہوتا ہے اور یقیناً اس کے ہاتھ تاریخ دان سے زیادہ کھلے ہیں۔

ہندوستانی ادب پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالیں تو کالی داس، رابندر ناتھ ٹیگور، سبرامنیم بھارتی، وارث شاہ جیسے شاعر ملتے ہیں جن کے فن اور شخصیت نے واقعی ہندوستانی فنونِ لطیفہ کو متاثر کیا لیکن غالب ان میں سب سے قدآور شخصیت کی حیثیت سے اُبھرے۔ غالب جیسے بلند مرتبہ لوگ اپنی ذہنی اپروچ کے اعتبار سے اپنے معاشرے سے آگے ہوتے ہیں اور اس طرح اُن کے اور معاشرے کے درمیان مخصوص قسم کے اختلافات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ فلم کے مواد کے اعتبار سے یہ اختلافات بڑے موزوں ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں وہ تمام عناصر موجود ہوتے ہیں جو کسی فلم کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ ایسی صورت میں تمام نابغہ لوگوں کی زندگیاں، خواہ وہ عظیم شاعر ہوں یا ادیب ہوں یا سیاسی لیڈر، فلم کے لیے بڑی دلچسپیاں رکھتے ہیں۔ منٹو کی تخلیقی اور تخیّلی قوت بے پناہ تھی۔ بقول علی سردار جعفری ''وہ ایک دو جملوں میں کردار بنا کر کھڑا کر سکتے تھے۔ منٹو کو کردار نگاری کے فن میں کمال مہارت حاصل تھی۔'' وہ قصّے کو مناسب موڑ دینے کے ماہر تھے۔ انسانی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے اور کردار نگاری کا بڑا سلیقہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر برج پریمی کی اس بات سے اتفاق کرنے میں کوئی تامّل نہیں کہ اُن چند اشاروں پر منٹو نے غالب کے مضمون کی یہ کہانی بنی۔ ظاہر ہے منٹو نے یہ فلمی افسانہ غالب کی محبت میں لکھا۔ منٹو اپنے قیامِ دہلی کے دوران اکتوبر ۱۹۴۱ء میں احمد ندیم قاسمی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں ''غالب'' کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھنے کا ارادہ کررہا ہوں۔ آپ شاعر ہیں، اگر آپ یہاں ہوتے تو مجھے کتنی مدد ملتی۔ میں نے غالب کے متعلق بہت سی کتابیں جمع کرلی ہیں، اور کتابیں بھی جمع کررہا ہوں۔ اگر آپ کے پاس ایسا رسالہ ہو جس میں غالب کی زندگی کے متعلق کوئی مضمون چھپا ہو تو فوراً بھیج دیں۔''

منٹو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> ''اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ میں آجکل ''غالب'' پر فلمی افسانہ لکھنے کے سلسلے

میں بہت مصروف ہوں۔ خدا جانے کیا کیا خرافات پڑھ رہا ہوں۔ سب کتابیں منگوالی ہیں۔ کام کی ایک بھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے سوانح نگار سوانح لکھتے ہیں یا لطیفے۔۔۔ کچھ مواد میں نے جمع کرلیا ہے اور کچھ ابھی جمع کرنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ افسانہ دلچسپ ہوجائے گا۔ یہ بات اپنے تک ہی رکھیے گا۔۔۔ دس مناظر لکھ چکا ہوں۔ جب نصف مکمل ہوجائے گا تو آپ کو مسودہ بھیج دوں گا۔ یہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔۔۔"

("منٹو کے خطوط" ص ۱۸۲،۱۷۹،۱۷۶)

ظاہر ہے منٹو نے اس کہانی کے لیے سب ذرائع سے مواد فراہم کیا اور حقائق کی جستجو میں کوئی کسر اُٹھا نہ چھوڑی۔ منٹو نے غالب سے اپنی عقیدت اور احترام کے باوصف کہانی لکھتے ہوئے حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ غالب کے محاسن اور معائب دونوں کا احاطہ کیا اور روشن اور تاریک پہلوؤں کو جوں کا توں کہانی میں سمودیا۔

منٹو نے مرزا غالب کے حوالے سے دلّی کی ایک حسین طوائف موتی عرف "چودھویں بیگم" کا انتخاب بھی کیا۔ اصل میں حُسن اور اسرار کسی بھی ادیب کے موضوع کے لیے بڑی دولت ہوتے ہیں اور طوائف کی ذات میں حُسن بھی ہے اور اسرار بھی۔ طوائف ہمارے کلاسیکی ادب کی ہیروئن تھی بلکہ برصغیر کی تہذیبی زنجیر میں طوائف کو ایک اہم کڑی کی حیثیت حاصل ہے اور پچھلی صدی کے ادب کا معاشرہ محض طوائف کی ذات سے متحرک نظر آتا ہے۔ طوائف کہیں علامت ہے کہیں حوالہ۔ ہماری اُردو شاعری کی طوائف جوش قدح سے بزم چراغاں کرتی رہی ہے۔ جیسے میر تقی میر دلّی کی سولہ سالہ باقی نامی خوبرو طوائف کے ہاں، شب بسری کے دوران اپنی جیب کٹوا آئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد غبار خاطر میں اپنی آشفتہ سری کا اقرار کرچکے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر سیاسی سفر میں بھی فیض آباد کی آواز سن آیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی ایک امیر بائی تھی اور جوش ملیح آبادی تو کئی گل رخوں کے غلام تھے جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔ آغا حشر کاشمیری مختار بائی امرتسر والی کی زلف کے اسیر تھے۔ داغ دہلوی کے ہاں بھی ایک طوائف تھی۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں قاضی عبدالغفار کا نام بھی آتا ہے کہ منی جان اُن کے حرم میں تھی اور اکبرالہ آبادی نے بوٹا بیگم سے نکاح پڑھوایا تھا۔ الغرض:

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

غالب کی موتی بیگم عرف چودھویں اور منٹو کی۔۔۔ سوگندھی، سلطانہ، سرتیا، زینت، نواب، شانتی، کنوندکور، سندر یلا وغیرہ، منٹو کی تو کئی طوائفیں تھیں۔ جہاں تک منٹو کی طوائفوں کا معاملہ ہے تو یہ

مضمون اُردو میں پہلے سے چلا آرہا تھا۔ بقول انتظار حسین ''اُردو ادب نے اس حوالے سے اب تک دو بڑے کردار پیدا کیے ہیں۔ امراؤ جان ادا اور سوگندھی۔ یہ کردار بھی ہیں اور اپنی جگہ دو تہذیبیں بھی۔''الغرض منٹو نے غالب کی ''ستم پیشہ ڈومنی'' کے رومانی قصے کو بڑی محنت سے اور ہنر مندی سے ترتیب دیا۔ غالب، چودھویں اور حشمت خان۔۔۔ محبت کی مثلیث تین کردار۔ کوتوال حشمت خاں جو دراصل غالب کی چاہتوں کا دشمن ہے اور ایک طرح سے غالب پر لکھے جانے والے منٹو کے اسکرپٹ کا ایک طاقتور ولن ہے۔ غالب کی زندگی کے مطالعے کے دوران یہی تینوں کردار اسکرپٹ کے لیے ایجنٹ گارنے کا کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود غالب نے بھی اسکرپٹ رائٹر منٹو کی مشکل اس طرح آسان کردی کہ غالب نے اپنے خطوط کے حوالے سے اپنی اچھی بُری ساری زندگی کا مکالموں کے ساتھ ایک نہایت جاندار اور مستند اسکرپٹ لکھ دیا تھا۔ یوں غالب کے خطوط نے غالب پر کسی نوعیت کا اسکرپٹ لکھنے والوں کی راہ آسان کردی ہے۔

عصمت چغتائی منٹو کے خاکے ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' میں الگ نقطہ نگاہ سے لکھتی ہیں۔''مرزا غالب (فلم) میں چودھویں بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو، اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور تھی۔''اس ضمن میں افسانہ نگار آغا بابر قم طراز ہیں:

''منٹو کو طوائف (کے موضوع) پر صرف فنی اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ وہ طوائف کو ایک مذہب کی طرح مانتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے لیے، جس چیز نے منٹو کو سب سے زیادہ اپیل کیا تھا، وہ طوائف کا کردار تھا جسے وہ مسکرا کر ''منگی'' کہتا تھا۔۔۔ اُس کا جوہر قابل طوائف جیسی بنجر شخصیت میں بھی پھل پھول ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی اور راجندر سنگھ بیدی جیسوں نے طوائف کے موضوع کی طرف رجوع کیا مگر منٹو کی خیال انگیزیوں اور ندرتوں کی بلندی کسے نصیب ہو سکی۔''

(مضمون: ''منٹو اور طوائف''، فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۰-۳۲۱)

منٹو کے ادب کی طوائف حقیقی ہے۔ غالب کی ''ستم پیشہ ڈومنی'' کے رومانی قصے کو منٹو نے حقیقی رنگ دینے کے لیے دلّی اور لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کا مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ غالب کے دَور کے لب و لہجہ کو خاص اُسی پس منظر میں رکھنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے منٹو کی بیگم صفیہ ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''منٹو نے فلمی دنیا میں رہتے ہوئے جو سب سے بڑا کام کیا وہ فلم ''مرزا غالب'' کی کہانی

تھی۔ اِس کہانی کی تکمیل کی خاطر منٹو صاحب نے بے شمار کتابیں خریدیں اور اُن کا شب و روز مطالعہ کیا۔ ایک ہندوستانی (اہلِ زبان) بوڑھے شخص سے، جو اُن کے ایک دوست تھے، دِلی اور لکھنؤ کا لب ولہجہ اور وہاں کا رہن سہن ہر طرح سے سمجھا، تاکہ کہانی میں حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہو اور تماشائی فلم دیکھتے وقت اپنے آپ کو اس کا ایک کردار سمجھتے ہوئے محسوس کریں کہ وہ مرزا غالب کے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔''

(''روبرو۔ صفیہ بیگم'' انٹرویو شاہد شیدائی، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۶؍جنوری ۱۹۷۷ء)

اس سٹوری کے حوالے سے منٹو کے لڑکپن کے دوست ابو سعید قریشی کے بھائی، احمد سعید قم طراز ہیں:

''دونوں دوست (ابو سعید قریشی اور منٹو) ایک ہی بلڈنگ کشمیری گیٹ (حسن بلڈنگ) کی بالائی اور نچلی منزل پر اوپر تلے کے فلیٹوں میں پڑوسی بن گئے تھے۔ اس طرح کہ ہم اپنی دیوار پر سے جھک کر منٹو سے باتیں کرتے تھے۔۔۔۔ وہ اکثر اپنے دوغیر فلمائے فلمی اسکرپٹ پڑھ کر سناتا۔ ''خولدز'' اور ''مرزا غالب'' جو اس نے بقول اُس کے، علی الترتیب پروڈیوسر ڈائریکٹر محبوب خان اور سہراب مودی کے لیے لکھے تھے۔ گو مرزا غالب نامکمل تھا۔ اُس نے اس پر خاصی تحقیق کی تھی۔'' (مضمون: ''سعادت حسن سے منٹو تک'' ماہنامہ ''شان ہند'' دہلی)

منٹو اپنی خیال آفرینی میں حسن بلڈنگ نکلسن روڈ دہلی میں بیٹھے مرزا غالب کی زندگی کے کسی بھاگتے ہوئے لمحے کو گرفت میں لے کر حرارت اور روشنی بخش رہے تھے کہ اس اثناء میں ایک سانحہ ہوا۔ وہاں منٹو کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا عارف بیمار ہوا اور صرف دو دن کی بیماری کے بعد اپنی پہلی سالگرہ سے دو روز قبل فوت ہو گیا۔ اس المیے نے منٹو کو اندر سے بُری طرح گھائل کر دیا۔ وہ اعصابی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے منٹو نے سوا سو کے قریب چھوٹے بڑے فیچر اور ڈرامے لکھے تھے۔ جب اُن کا سوواں مسودہ براڈ کاسٹ ہوا تو ان کی وہی کیفیت تھی جیسے کرکٹ میچ میں کسی کھلاڑی کی سنچری مکمل ہو جائے تو وہ اپنی سنچری کو سکور بورڈ پر دیکھنا چاہتا ہے۔ منٹو نے بھی کہا کہ اس حوالے سے میری تصویر آل انڈیا ریڈیو کے رسالوں کے سرورق پر چھپنی چاہیے لیکن تصویر کو ''آواز'' رسالے کے اندر کے صفحات میں صرف چار مربع انچ جگہ ملی۔ اس کے ساتھ چوکھٹے میں لکھا تھا ''سعادت حسن منٹو جن کے سو فیچر اور ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں''۔۔۔ منٹو کا اس معمولی قسم کی کوریج پر جی کھٹا ہو گیا۔ بچہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا اور ریڈیو والوں کی تحکمانہ مصلحتوں نے اُس بچے کو، جو ایک فنکار کے سینے میں سورہا تھا، ایک اور کھلونے سے محروم کر دیا۔ منٹو بددلی اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ پھر اوپندر ناتھ اشک سے بھی ریڈیو اسٹیشن میں چشمک، جس کا اظہار

افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک نے منٹو پر لکھے خاکے ''منٹو میرا دشمن'' میں تفصیل سے کیا ہے۔

ان حالات سے منٹو کا دل دہلی سے اُچاٹ ہو گیا۔ اسی اثناء میں ''مصور'' ویکلی بمبئی کے مالک نذیر لدھیانوی کا ایک خط موصول ہوا کہ یہاں سید شوکت حسین رضوی آپ سے ایک فلمی کہانی لکھوانا چاہتے ہیں لہٰذا ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر منٹو بمبئی چلے گئے اور شوکت حسین رضوی کی فلم ''نوکر'' کی کہانی لکھی۔ اس کے بعد وہ ''فلمستان'' سے بطور سٹوری رائٹر وابستہ ہو گئے۔ اس فلم ساز ادارے کے لیے انہوں نے کئی فلمیں چل چل رے نوجوان، بیگم، شکاری، آٹھ دن وغیرہ لکھیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے کچھ اور اداروں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھے اور ساتھ ساتھ نامکمل ''مرزا غالب'' کے اسکرپٹ کو بھی تشکیل دیتے رہتے۔ منٹو نے بہت توجہ اور وقت صرف کیا تا کہ وہ معتبر اور مستند حقائق پر مبنی ہو اور تاریخی پہلو سے اس پر انگشت نمائی نہ کی جا سکے۔ ماس دوران ملکی حالات تیزی سے بگڑتے گئے یہاں تک کہ فسادات کی آگ میں ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ تقسیمِ ملک کے چند ماہ بعد منٹو پاکستان چلے آئے۔

یہ کہانی منٹو نے غالب سے عقیدت اور محبت میں لکھی تھی ستم ظریفی کہ اتنی شب و روز کی محنت اور عرق ریزی سے لکھی ہوئی کہانی کو بمبئی میں کوئی بھی فلمانے کو تیار نہ تھا۔ بمبئی میں منٹو نے جس پروڈیوسر کو بھی اس کا اسکرپٹ دکھایا، اُس نے انکار کر دیا۔ فلمستان اسٹوڈیو میں ملازمت کے ایام میں معروف ادیب اوپندر ناتھ اشک بھی وہاں بطور مکالمہ نگار ملازم تھے۔ منٹو سے اپنی چشمک کے حوالے سے اپنے ایک یادگار مضمون میں اوپندر ناتھ اشک رقم طراز ہیں:

''منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ (پروڈیوسر ایس) مکر جی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لیے منٹو کو غالب کے شعر سناتے میں نے دیکھا ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکر جی کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ اپنے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں۔'' (''منٹو میرا دشمن'' مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۵۲)

جیسا کہ اوپندر ناتھ اشک نے ذکر کیا چونکہ منٹو فلمستان کے لیے کہانیاں لکھتے تھے۔ اپنی اس نئی کہانی کے فلمائے جانے کے لیے منٹو کی یہ کوشش ہو سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف والا معاملہ تھا۔ اس لیے کہ غالب منٹو کا محبوب تھا۔ اپنی تخلیق کو فلمی قالب میں ڈھالنے کے لیے انھیں فلم کمپنی کے قضا و قدر کے مالک مکر جی کی خوشامد سے بھی عار نہیں تھا، لیکن فلم میکر زیادہ تر پارسی، مارواڑی اور جنوبی

ہندوستان کے لوگ تھے، منٹو کو اس قسم کی باتوں سے بھی واسطہ پڑا کہ ''غالب کون ہے؟''۔۔۔ ہم تو صرف ٹیگور کو جانتے ہیں۔'' ان باتوں سے غالب کی ناقدری کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان میں، خصوصاً ساؤتھ کے علاقوں میں لوگ غالب کی شاعری سے اتنا روشناس نہ تھے۔ سہراب مودی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے منٹو کے اس کام کو کارنامہ قرار دیتے ہوئے فلمانے کا عزم کیا۔ مرزا غالب ایک مشکل پسند اور فلسفی شاعر اور پھر کلام میں فارسی تراکیب کی آمیزش تھی۔۔۔ دلچسپ بات یہ کہ فلمساز سہراب مودی کی اپنی زبان گجراتی تھی۔ وہ اگرچہ اُردو لکھ پڑھ نہ سکتے تھے مگر ادبی ذوق کے مالک تھے اور اچھی نثر اور اچھی شاعری کا ادراک رکھتے تھے۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ یہ فلم بنانے سے باز رہیں۔ جو لوگ اُردو نہیں جانتے، ظاہر ہے وہ غالب کو بھی نہیں جانتے۔ فلم میں کیا دلچسپی رہے گی اور پھر مدراس، بنگال اور مہاراشٹر جیسے علاقوں میں کون یہ فلم دیکھے گا۔ مگر سہراب مودی اسے فلمانے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ جب سہراب مودی نے ڈھول جاٹ رہے منٹو کے اسکرپٹ کی گرد جھاڑی اور اس پر فلم بنانے کا ارادہ کیا تو یہ اندازہ اُس پختہ کار فلم ساز کو بھی نہ تھا کہ یہ کس قدر اہم اور شہرت یافتہ تخلیق ہوگی۔ اس سے پہلے منروا مووی ٹون کے بینر تلے بڑے طمطراق کے ساتھ بننے والی ہندوستان کی پہلی کلر بائی ٹیکنی کلر فلم ''جھانسی کی رانی'' جس پر سہراب مودی نے پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا وہ بدقسمتی سے ایک بلبلے کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ منروا مووی ٹون کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور سہراب مودی کی کمر ٹوٹ چکی تھی لیکن وہ ایک باہمت آدمی تھے اگلا قدم سوچ سمجھ کر اُٹھاتا تھا۔

جے کے نندہ نے سکرین پلے کی نوک پلک سنواری، ۱۹۵۴ء میں سہراب مودی نے یہ کہانی فلم بند کرنا شروع کی جس میں غالب کی حیات، شخصیت اور عہد کو انتہائی عمدہ انداز میں پیش کیا گیا۔ اُن دنوں ساغر نظامی بھی مرزا مووی ٹون سے وابستہ تھے۔ اس کی تیاری میں وہ بھی شامل تھے۔ فلم کی تشکیل کے حوالے سے یہ تفصیل بھارتی ادیب و ہدایتکار محافظ حیدر بیان کرتے ہیں:

''سہراب مودی نے جھانسی کی رانی کے بعد دو فلموں کا پلان بنایا تھا۔ ایک تو تھی وکٹر ہیوگو کے ناول Les miserbale کو ماخذ بنا کر ''کندن'' [1] جس میں انہوں نے خود گٹ اپ بدل بدل کر کئی رول بھی کیے تھے اور دوسری کے لیے اپنے دفتر سے کاغذات کے اس پلندے کو جھاڑ پونچھ کر نکالا جو برسوں پہلے اُردو کے صاحب طرز اور منفرد افسانہ نگار سعادت حسن منٹو

ا۔ بقول مصنف سید قاسم محمود، اس عالمی شہرت یافتہ ناول کی تلخیص بھی سعادت حسن منٹو نے کی تھی۔ (بحوالہ: ''افسانہ ڈائجسٹ'' اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۷۳)

نے انہیں فروخت کیا تھا۔ یہ کہانی مرزا غالب کے ایک فرضی معاشقے پر مبنی ایک فلم کے لیے لکھی گئی تھی۔ سہراب مودی غالب کے بھی رسیا تھے اور منٹو کے بھی۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی افراتفری میں اور فرقہ وارانہ تناؤ کے ماحول میں غالب پر فلم بنانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ پھر ''جھانسی کی رانی'' نے سہراب مودی اور منروا کا بہت وقت لے لیا تھا۔ اب ہر طرح سے صحیح موقع تھا۔ اتنے بڑے ادیب کی لکھی ہوئی کہانی کے لیے مکالمے لکھوانے کی غرض سے سہراب مودی کی نظر انتخاب ایک اتنے ہی بڑے ادیب پر گئی۔ یہ تھے راجندر سنگھ بیدی۔ کاسٹنگ میں بھی سہراب مودی صحیح راستے پر چل پڑے۔ کافی عرصہ پہلے اور وہ بھی اُس زمانے میں جب کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں کاسٹنگ کے فن سے شاید ہی کوئی واقف تھا۔ سہراب مودی نے فلم ''پکار'' کے لیے چندر موہن کو شہنشاہ جہانگیر، نسیم کو نور جہاں، اور فلم ''سکندر اعظم'' میں پرتھوی راج کپور کو سکندر اور ونمالا کو رخسانہ کے رول میں منتخب کر کے اپنی پرکھ کا معیار قائم کر دیا تھا اور دھاک بٹھا دی تھی۔ اس بار غالب کے رول میں انہوں نے ایک ایسے اداکار کو چُن لیا جس پر Type-casting کی چھاپ لگی تھی اور جو Legendary کرداروں کے رول میں خوب جچتا بھی تھا اور پسند کیا جاتا تھا۔ 1944 میں کلکتے میں بنی فلم ''بھگت کبیر'' میں کبیر کا رول کر کے وہ معروف ہو چکا تھا اور بمبئی آنے کے بعد ''بیجو باورا'' اور ''چیتنیہ مہا پربھو'' سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ تھا بھارت بھوشن۔ اس کی معشوقہ کے روپ میں ثریا کو لیا گیا جو اُس دَور میں ایک ایسی ہیروئن تھی جو اپنے گانے خود ہی گاتی تھی اور وہ اور اُس کے گانے عوام میں بے حد مقبول ہو چکے تھے۔۔۔ غالب کی شریک حیات امراؤ بیگم کے لیے نگار سلطانہ لی گئی جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ادا کارہ بھی اچھی تھی۔ اس فلم کی موسیقی کے لیے غلام محمد لیے گئے جو صفِ اول کے میوزک ڈائرکٹر نوشاد علی کے کئی سال تک چیف اسسٹنٹ تھے اور میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے پروڈیوسر ایم صادق اور ہیروئین ثریا کی کئی ہٹ فلموں سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ راگ راگنیوں کے بھی ماہر تھے اور لے تال کے بھی۔ اور انہیں سینما تک میوزک کی بڑی سمجھ تھی۔ (ان کی آخری فلم تھی ''پاکیزہ'' جس کے ریلیز ہونے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا) غرض ان سب کا انتخاب کر کے سہراب مودی نے آدھی مہم فتح کر لی۔

ظاہر ہے کہ ڈھائی تین گھنٹے کی ایک فلم میں غالب کی پوری زندگی سما نہیں سکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک ٹی وی سیریل ہی کی طوالت موزوں اور مناسب ہو سکتی ہے۔۔۔ اس فلم میں غالب کا ایک فرضی معاشقہ فلم کے میڈیم کو مدنظر رکھتے ہوئے گڑھ لیا گیا۔

چنانچہ سعادت حسن منٹو کے زرخیز تخیل نے غالب کو ایک طوائف سے Involve کر کے ایک دلچسپ کہانی گڑھ لی تھی۔ غالب نے اپنے ایک خط میں کسی ڈومنی سے اپنے مختصر معاشقے کا ذکر تو کیا ہے لیکن کسی طوائف سے بھی وہ عشق میں مبتلا ہوئے ہوں اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ لیکن بھلا ہو ہماری فلمی روایت کا۔ منٹو کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے مگر صرف منٹو ہی کیا، غالب سے متعلق ٹی وی سیریل اور دوردرشن سے پیش کیے گئے وہ تمام ٹی وی سیریل جو اُردو شاعروں کے موضوع پر بنائے گئے تھے ان کے رائٹروں نے بھی، بہ استثنائے چند، اپنی سوڈز کو دلچسپ بنانے کے لیے اور گانوں کی چویشن نکالنے کے لیے طوائفوں کا سہارا لیا۔ اس کا ایک ناخوشگوار اور لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اُردو داں ناظرین میں ان اُردو شاعروں کی خانگی زندگی کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوئی۔ بہر کیف یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، ایک شادی شدہ کردار کی زندگی میں طوائف کے قدم رکھنے سے ایک مثلث بن جاتی ہے جس کے ہر زاویے میں نزاع (Conflict) پوشیدہ ہوتا ہے جو ڈرامے کو جنم دیتا ہے۔ غالب کی شادی شدہ زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ ان کو اپنی بیگم سے اپنی شاعری کے لیے کوئی Inspiration نہیں ملتا تھا۔ اس لیے جب ایک طوائف سے، جو نہ صرف ان کے کلام کی زبردست مداح تھی اور اسے اپنے انداز سے سُروں میں سجاتی بھی تھی۔ ان سے دل ہی دل میں محبت بھی کرتی تھی، غالب کو عشق ہو جاتا ہے اور انہیں ایک Source of inspiration نصیب ہو جاتا ہے اور وہ ایسی شاعری کرنے لگتے ہیں جسے بقائے دوام مل جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی عام قسم کی مثلث ہے جسے ہم مختصر طور پر ''پتی پتنی اور وہ'' کہہ سکتے ہیں اور جو فلموں میں اکثر و بیشتر نظر آتی ہے لیکن ہمیشہ دلچسپ لگتی ہے کیوں کہ فطری طور پر چاہے بیوی کے علاوہ شوہر کی کسی اور سے محبت صحیح ہو مگر سماجی طور پر غیر اخلاقی سمجھی جاتی ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے غیر اخلاقی حرکتیں بھی قاری یا ناظر کے لیے ڈرامہ پیدا کرتی ہیں۔ فلم ''مرزا غالب'' کی کہانی میں تنوع نہ ہونے اور غالب کی زندگی سے متعلق کسی صداقت کے نہ ہونے پر بھی منٹو کی کہانی کو بیدی کے منظر نامے اور سہراب (مودی) کے Treatment نے اس طرح اُبھار دیا کہ فلم میں جان پڑ گئی۔''

(مضمون: غالب اور سینما'' غالب اور فنونِ لطیفہ'' از زبیر رضوی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۴ء ص ۹۸)

سہراب مودی ایک پختہ کار اور روشن خیال ہدایت کار تھے۔ انہوں نے بڑی تحقیق اور سوجھ بوجھ سے ''مرزا غالب'' بنائی۔ اِس میں دہلی کا اصل ماحول پیش کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ منٹو پاکستان آ

چکے تھے، اس لیے فلم کے مکالمے نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی سے لکھوائے گئے۔ گنگا جمنی کی زبان میں لکھے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کے مکالمے اور پرانی دلی کا رہن سہن دیکھنے والوں کے لیے بڑی دلچسپ تفریح تھی۔ اس میں راجندر سنگھ بیدی کے چست اور ادبی رنگ مکالموں نے نئی روح پھونک دی تھی۔ یہ فلم بیدی کے فلمی کریئر کے لیے بھی پیش رو ثابت ہوئی۔ جیسا کہ ذکر ہوا اس فلم میں مرزا غالب کا کردار اداکار بھارت بھوشن نے ادا کیا تھا۔ اداکارہ ثریا نے اس میں طوائف چودھویں کا رول کیا اور نگار سلطانہ نے بیوی کا۔ ان کے علاوہ فلم کی دیگر کاسٹ میں دُرگا کھوٹے، الھاس، افتخار، مراد، بکری اور جگدیش سیٹھی تھے۔ یہ سہراب مودی کی بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔

''مرزا غالب'' ریلیز ہونے سے پیشتر اس فلم کو مرکزی سنسر بورڈ نے ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس پر یہ اعتراض لگا کر سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا کہ فلم کی ہیروئن ثریا کے جسمانی خطوط فلم میں بہت نمایاں انداز میں دکھائے گئے ہیں اور یہ بات فحاشی میں آتی ہے۔ شومئی قسمت، ممنوع کی یہ کہانی بھی معتوب ٹھہری۔ مغنوی طوائف ایک بار پھر حکومتی تختہ دار پر آ گئی۔ حالانکہ ثریا نے فلم کے لیے مکمل لباس استعمال کیے تھے، یعنی بند گلے اور پوری آستین کے کُرتے، پشوازیں اور غرارے پاچُست پاجامے پہنے تھے۔ اس لیے عریانی یا فحاشی کا کوئی سوال نہیں بنتا تھا۔ سہراب مودی نے مرکزی سنسر بورڈ میں اپیل کی۔ سنسر بورڈ کو اعتراض تھا کہ ہیروئن کی حرکات و سکنات تماشائیوں کے لیے باعثِ لذت ہیں۔ جب وہ حرکت کرتی ہے تو فلم دیکھنے والوں کی نگاہیں ؟ مانی اعضاء پر جم کر رہ جاتی ہیں جو قابلِ اعتراض بات ہے۔ بہت زیادہ شور مچا تو مرکزی وزیر اطلاعات نے فلم دیکھی اور جن مناظر میں ثریا کے جوبن کو نمایاں سمجھا گیا اُن پر قینچی چلانے کا حکم صادر فرما دیا۔ جب ساری محنت اکارت جاتی نظر آئی تو مجبوراً سہراب مودی نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کرنے کی ٹھانی اور ان سے وقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ملاقات میں ثریا اور گلوکار محمد رفیع بھی ساتھ گئے۔ اس وقت ثریا نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو فلم کے اکثر متنازعہ سین میں پہنا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بڑی شستہ اُردو بولتے تھے۔ اُردو ادب اور شاعری سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کے ساتھ تو خصوصی ارادت تھی۔ فلم انڈسٹری کی تقاریب وغیرہ میں بھی شریک ہوتے تھے۔ بلکہ فلم سے متعلقہ افراد سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے سہراب مودی اور ثریا سے بہت عزت و احترام سے ملاقات کی اور مسئلہ دریافت کیا۔ سہراب مودی نے فلم پر سنسر بورڈ کا اعتراض بیان کیا۔ اس بات چیت

کے دوران ثریا نے کہا، ''پنڈت جی! آپ میرے لباس کو ایک نظر دیکھیے، پرانے زمانے میں دلی میں ایسا لباس پہنا جاتا تھا۔ آپ کے سنسر بورڈ اور اطلاعات کے وزیر صاحب نے میرے اس لباس کو بے ہودہ قرار دیا ہے۔ اس میں عریانی کی کون سی بات نظر آتی ہے؟'' وزیر اطلاعات صاحب بھی اُس ملاقات میں شریک تھے۔ وہ اپنے اعتراض پر مُصر رہے کہ اس لباس میں ہیروئن کا جسم نمایاں نظر آتا ہے، جو فلم دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ ثریا نے جواباً کہا، ''میں نے لاتعداد فلموں میں کام کیا ہے اور مجھ پر کبھی عریانی کا الزام نہیں لگا۔ اس فلم میں پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کی زندگی پر بنائی جانے والی فلم میں مَیں نے وہی لباس پہنا ہے جو اُس دور کی خواتین کا من پسند لباس تھا۔ اب اگر میرے جسم کے بارے میں کوئی اعتراض ہے تو اس سلسلے میں مَیں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

سہراب مودی کی دعوت پر پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے فلم ''مرزا غالب'' کے خصوصی شو کا انتظام کیا گیا۔ جواہر لال نہرو نے اُن اعتراضات کو نامناسب قرار دیتے ہوئے وزیر اطلاعات کو سنسر سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی ہدایت کی۔ انھوں نے فلم بہت پسند کی اور مبارک باد دیتے ہوئے سہراب مودی سے کہا، ''غالب کو ہندوستان کے عام لوگوں میں متعارف کرانا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ گو غالب کا کلام کسی آواز کا محتاج نہیں مگر سچ ہے، آپ نے اس کے ساتھ پورا انصاف کیا۔''

منٹو کی لکھی کہانی پر مزدا مووی ٹون کے بینر تلے بننے والی یہ فلم حکومتی غلام گردشوں سے نکل کر جب پردۂ سکرین پر جلوہ گر ہوئی تو بہت مقبول ہوئی۔ بھارت بھوشن کو چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنے غالب کے روپ میں لوگوں نے بہت سراہا۔ منٹو کے تخیلاتی کردار 'چودھویں' میں قدیم مشرقی ملبوسات میں ثریا کا ہوش رُبا پیکر کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اِس فلم نے ثریا کی عظمت میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ یہ اُردو زبان کی بھی بڑی کامیابی تھی۔ خصوصاً بنگال، مدراس اور مہاراشٹر کے علاقوں میں، جہاں لوگ مرزا غالب کو ''گالب'' کہتے تھے۔

تاریخی فلم محض تذکرہ ہوتا ہے۔ کہانی تو ایک بہانہ ہوتی ہے جس کی مدد سے اُس عہد کی پرچھائیاں فلم بند کی جاتی ہیں۔ ''مرزا غالب'' میں بھارت بھوشن نے غالب کا کردار ادا کر کے زوال پذیر مغلیہ عہد اور معاشرے کی بھرپور کیفیت کی عکاسی کی تھی۔ اس میں مرزا غالب جب جیل سے رہا ہو کر اپنی محبوبہ کے یہاں آتے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ اُس وقت وہ ایک سادہ مگر دُکھ بھرے جملے میں اُس عہد کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ''ارے کہاں ہو دِلّی والو!۔۔۔ دن

دہاڑے ہی سو گئے؟'' دیکھیے اب کس طرح وہ سارا عہد اِس میں پرو دیا گیا ہے۔ مرزا غالب فلم نے غالب کی شخصیت، اُن کے دور کے کرب، ہندوستان کی تڑپتی آتما!۔۔۔ اور مشترکہ میراث کے لٹنے کے غم کو عام فلم بین تک پہنچایا جو کوئی ماہر نفسیات بھی نہ کر سکا۔ منٹو کی اس تحریر کو سہراب مودی نے اتنی عمدگی سے پیش کیا کہ غالب کی بے لوث دے ریا شخصیت کا ''کرشمہ'' چلتا ہوا جادو بن گیا۔

اس فلم کے لیے غالب کی عام فہم غزلوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ موسیقی کے لیے پہلے خواجہ خورشید انور کو منتخب کیا گیا۔ خواجہ صاحب رضا مند بھی ہو گئے تھے مگر بعض وجوہات کے سبب وقت نہ دے سکے۔ پھر اس کی موسیقی غلام محمد نے دی اور واقعہ یہ ہے کہ منٹو کی خیال آفرینی، سہراب مودی کی منجھی ہوئی ہدایت کاری سے بڑھ کر اس فلم کی کامیابی اور مقبولیت کا اولین سبب غلام محمد کا جادو بھرا سنگیت بھی تھا جسے یقیناً غالب کی شاعری ہی نے Inpire کیا اور تا دیر عرصہ گزرنے پر بھی سننے والوں کو ہمیشہ کی طرح مدھوش کر دیتا ہے۔ موسیقار غلام محمد نے ثریا، طلعت محمود اور محمد رفیع کی آوازوں میں غالب کی آسان بندشوں میں دلنواز طرزیں بنائیں جو کہ غزلوں کے مزاج کے مطابق تھیں۔

''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے''، ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک''، ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو''، ''نکتہ چیں ہے غمِ دل جس کو سنائے نہ بنے''، ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا''، ''عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی''، ''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'' اور پھر محمد رفیع کی آواز میں ''کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور''۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ثریا، محمد رفیع اور طلعت محمود نے ایسی دلنشین گائیکی میں ان غزلوں کو سمویا تھا کہ اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی جیسے ان کے گلوں میں راگ راگنیوں کے خزانے بھرے تھے۔ تمام نغمے اپنی اپنی سچوایشن میں، احساسات وجذبات سے مرصع ہیروں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔

فلم کے سلسلے میں غالب کی سی ارسٹوکریسی ذرا مشکل امر ہے، کیونکہ اس میں کسی خاص مقام تک جانے کے لیے پبلک کو ساتھ لے کر جانا پڑتا ہے۔ ثریا بیک وقت اداکارہ اور گلوکارہ تھی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو محض گنے چنے فنکاروں ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ غالب کی غزلوں کو ثریا نے نکھار کر ایک نیا روپ دے دیا۔ گو غالب کی شاعری ثریا کی آواز کی محتاج نہ تھی لیکن ثریا اپنی عظمت کو چھونے کے لیے غالب کی شاعری کی محتاج تھی۔ موسیقاروں اور سامعین کی رائے ہے کہ ثریا کی آواز منفرد تھی۔ اس کی نغمگی میں سوز اور تاثر کا جو عنصر ہے اس میں ایک ایسی کیفیت تھی جو ہر عمر کے لوگوں کو مسحور کر دیتی تھی۔ اس نے غالب کی غزلیں گا کر خود کو ایک منفرد اور ناقابلِ فراموش گلوکارہ ثابت کر دیا تھا۔

خواجہ خورشید انور نے ایک بار ثریا کے بارے میں کہا تھا،''اس کی آواز ایک بلانگ پیپر (جاذب) کی طرح ہے جو میرے گیت کی دھن اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور پھر گاتے ہوئے ان سب کو بنا سنوار کر گائیکی میں پیش کر دیتی ہے۔''

دیوانِ غالب کی غزلوں کے علاوہ، شکیل بدایونی کے کچھ گیت بھی سچوایشن کے لیے اس میں شامل کیے گئے تھے۔''مورے بانکے بلم کوتوال''،''سیاں تیری خیر ہو جی بلما تیری خیر ہو''اور''دیوانے یہاں تک آ پہنچے''(قوالی)۔

اِس فلم کے نغمات کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ غیر اُردو داں طبقے کے وہ لوگ جنھوں نے غالب کا نام ہی نہ سنا تھا۔وہ غالب سے واقف ہوئے اور جنھوں نے غالب کا کلام پڑھا تھا اور نہ سنا تھا، اس سے محظوظ ہوئے اور اپنی اپنی زبان میں انہوں نے غالب کا کلام تلاش کیا یا اپنے اردو داں احباب سے غالب کی شاعری کے متعلق معلومات حاصل کیں اور سب سے بڑھ کر اُردو داں اُس طبقے نے اسے بہت سراہا، جو کبھی فلم دیکھتے ہی نہ تھے۔

اُس زمانے میں بھارتی فلمیں پاکستان میں آزادانہ نہیں آتی تھیں لیکن''مرزا غالب''کے گیت ریڈیو اور ریکارڈوں کے ذریعے پاکستان میں بھی شوق سے سنے جاتے تھے۔سہراب مودی کی اس فلم میں ثریا، محمد رفیع اور غلام محمد کی طرف سے غالب کو یہ بہت خوبصورت خراجِ عقیدت تھا اور غالب کی غزلوں اور نام کو برصغیر کے گھر گھر پہنچانے کی یہ سعادت ہندوستان کے ایک پارسی۔۔۔ سہراب مودی کے حصے میں آئی تھی۔

فلم مرزا غالب کی مکالمہ نگاری کی کامیابی سے افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی بلند قامتی میں بھی اضافہ ہوا۔راجندر سنگھ بیدی، فلم اور ادب کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''فلم یوں تو کھیل ہے لیکن فلم بنانا کھیل نہیں ہے۔فلم بناتے وقت ہم ہر قدم پر ایسے بیسیوں خطرات سے دوچار ہوتے ہیں۔مجھے یاد ہے جب میں نے''مرزا غالب''کے مکالمے لکھے تو اوّل و آخر ہمارے سامنے مقصد یہ تھا کہ دیش کے کونے کونے میں مرزا غالب کا کلام گونجے۔لوگ اُن کے خیالات اور اُن کی شاعری کی عظمت سے رُوشناس ہوں۔۔۔ (لیکن)''مرزا غالب''پر بھی کچھ لوگوں کو سوجھی کہ مرزا غالب کی عشقیہ زندگی کیوں پیش کی گئی؟ جیسے وہ انسان نہیں تھے۔اُن کے دل نہیں تھا۔میں پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف لوگ''مرزا غالب''جیسی فلموں کے خلاف ہیں اور دوسری طرف بھارت

سرکار انہیں سال کی بہترین فلم قرار دیتی ہے۔''
(''فلم بنانا کھیل نہیں'' کلیات بیدی، مرتب آصف نواز، مکتبہ شعروادب لاہور جولائی ۱۹۸۸، ص ۱۰۵۷)

راجندر سنگھ بیدی مزید لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ فلم ادبی شہ پارہ نہ ہوتے ہوئے بھی ادب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہر فلم ساز کو ادب کی ضرورت ہے اور ہونی چاہیے۔ ادب فلم سے بے نیاز ہے اور رہ سکتا ہے، لیکن فلم ادب سے نہیں۔۔۔ فلمی صنعت کے پیشروؤں کا نظریہ آج کے فلم سازوں سے قطعی جداگانہ تھا۔ انہوں نے کہانی کے مقصدی ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا، جس کے ثبوت میں آج بھی اُن فلموں کی طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے جو ادبی شہ پاروں پر بنائی گئی تھیں اور جنہیں باکس آفس پر اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ بہر حال پریتا، ہیراج بہو، مرزا غالب اور کندن جیسی کامیاب فلموں کے بننے کے بعد یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ ادب کے متعلق فلم سازوں کے خیالات ہمیشہ اتنے معاندانہ نہیں رہیں گے۔''
(مضمون: ''ادب سے فلم تک''، ماہنامہ ''افکار'' کراچی، اپریل ۱۹۵۷، ص ۱۰۰-۱۰۱)

سہراب مودی نے غالب کو فلم بند کر کے ایسا ہر دلعزیز بنا دیا کہ باید و شاید۔ کہتے ہیں اس فلم کے کامیاب بزنس سے سہراب مودی نے شکستہ حال مزار غالب کی تعمیر بھی کرائی تھی، مگر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی شائع کردہ کتاب ''نوادر غالب''، جس میں غالب اور ذوق کی قبروں کا تفصیلاً تذکرہ ہے، اُس میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا۔ اس تناظر میں راقم الحروف نے غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کے اُس وقت کے ڈائریکٹر جناب شاہد ماہلی صاحب سے اپریل ۲۰۰۹ء میں دہلی میں ملاقات کی تھی تو انہوں نے وضاحت فرماتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہمارے علم میں ایسے کوئی شواہد نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے سہراب مودی نے کسی کو کوئی رقم دی ہو یا پھر اس طرح کی کوئی اور مومنٹ کی ہو، مگر مزار غالب کی باقاعدہ تعمیر کے ضمن میں ایسی کوئی واضح بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔''

فلم ''مرزا غالب'' کی مقبولیت کو دیکھ کر ۱۹۶۱ء میں فلمساز سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی نے پاکستان میں بھی ''غالب'' نام سے چربہ فلم بنائی تھی جس میں غالب کا کردار اداکار سدھیر نے کیا تھا اور نور جہاں چودھویں کے روپ میں پیش ہوئیں اور یہ بحیثیت اداکارہ نور جہاں کی آخری فلم تھی۔ غالباً حبیب جالب نے بھی اس میں حکیم مومن خاں مومن کا ایک مختصر رول کیا تھا مگر سدھیر کو مرزا غالب کے روپ

میں پسند نہیں کیا گیا۔ یہ بہت ناقص اور غیر معیاری تھی، سہراب مودی کی مرزا غالب ہر اعتبار سے بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ ثریا کی گائی ہوئی غزلیں پاکستانی مرزا غالب میں میڈم نور جہاں نے گائیں اور اُن میں مُرکیوں اور تانوں کا اضافہ بھی کیا۔ مگر سچ ہے کہ ثریا کی آواز اور سادہ گائیکی نے سننے والوں کو زیادہ متاثر کیا تھا اور ثریا کی غزلوں کو سارا ہندوستان گانے لگا تھا۔

تاہم ''مرزا غالب'' سہراب مودی کی بہترین فلموں میں سے ایک تھی اور اس کی ریلیز نے غالب کو سارے ہندوستان میں روشناس کرا دیا۔ خصوصاً ساؤتھ کے علاقوں میں، جہاں لوگ ٹیگور کو جانتے تھے غالب کو نہیں۔ ''مرزا غالب'' ہندوستان کے ہر صوبے میں سپر ہٹ ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی نے نہ صرف فلم بینوں بلکہ ناقدین سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ یہ اوّلین اُردو فلم تھی جسے بھارت میں قومی اعزاز سے سرفراز کیا گیا اور صدر جمہوریہ کے سنہری تمغے سے نوازا گیا۔ اپنے فلمی کیریئر میں، سینما کے حوالے سے منٹو کا سب سے بڑا کارنامہ ''مرزا غالب'' ہے۔ یہ فلم ۱۹۵۵ء میں ریلیز ہوئی۔ لیکن افسوس اس کی شاندار کامیابی کے وقت منٹو اس دنیا میں موجود نہیں تھے۔

اسکرپٹ فلم

مرزا غالب

MINERVA MOVIETONE
presents
Nupur
NOW
39/-
mirza
Ghalib
PRODUCED & DIRECTED BY
SOHRAB MODI
DVD

کہانی: سعادت حسن منٹو

کردار

۱ : مرزا غالب
۲ : امراؤ بیگم
۳ : چودھویں بیگم
۴ : حشمت خان (کوتوال)
۵ : ملکہ جان (چودھویں کی ماں)
۶ : الٰہی بخش معروف (امراؤ بیگم کا والد)
۷ : بہادر شاہ ظفر
۸ : زینت بیگم
۹ : مفتی صدرالدین آزردہ
۱۰ : شیخ ابراہیم ذوق
۱۱ : حکیم مومن خاں مومن
۱۲ : بالم قد حضور
۱۳ : نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ
۱۴ : جناب محمد علی تشنہ
۱۵ : حکیم آغا جان عیش
۱۶ : کلو (غالب کا ملازم)
۱۷ : فدن (چودھویں کا خدمت گار)
۱۸ : متھرا داس (مہاجن)

دیگر کردار

سورداس (فقیر)، پان فروش چھبیلی، نوشاد علی، عارف، حاجرہ، حافظ جی، خورشید میاں، ٹیپو، نازو، کالے شاہ صاحب، شاہی اہلکار، منادی، مزدور، سپاہی، جیلر، ریذیڈنٹ بہادر۔

(ٹائٹل)

پیش کش : منروا مووی ٹون بمبئی

کاسٹ . بھارت بھوشن، ثریا، نگار سلطانہ، الہاس، درگا کھوٹے، مراد، افتخار، مکری، بیج شیاما، جیلانی، کم کم، غلام محی الدین، اندرا، روشن کماری، تنویر، شاہ آغا، کرشنا کمار، شریف، سعادت علی اور جگدیش سیٹھی۔

سٹوری :	ایس ایچ منٹو
سکرین پلے :	جے کے نندہ
مکالمے :	راجندر سنگھ بیدی
غزلیں :	دیوانِ غالب
گیت :	شکیل بدایونی
موسیقی :	غلام محمد
رقص :	لچھو مہاراج، بدری پرشاد، ی شر دھاکر
ایڈیٹر :	پی بال چندر
پروڈکشن چیف :	سعادت علی
اسسٹنٹ ڈائریکٹر :	وڈیا بھوشن
ریکارڈنگ :	ایم ایڈل جی
فوٹوگرافی :	دی ارادھت
آرٹ ڈائریکٹر :	رشی کے بانکار
پروڈیوسر و ڈائریکٹر:	**سہراب مودی**

(اشتہار) : ——(ہندی رسم الخط میں)——

(اشتہار): یہ تصویر مرزا غالب کی زندگی کے کچھ واقعات پر بنایا ہوا فلمی ناٹک ہے جس میں کافی خیالی واقعات اور کردار شامل کر دیئے گئے ہیں جنہیں تاریخی نہ سمجھا جائے۔

مونتاژ

پرانی دِلّی کے مناظر۔ قطب مینار، جامع مسجد، لال قلعہ اور اندرونِ دِلّی کے کوچہ و بازار ۔۔۔ دِلّی جو سات بار اُجڑی اور ہر بار نئے سرے سے آباد ہوئی اور ہر بار جب آباد ہوئی تو بہت جلد اپنے پرانے رنگ روپ میں نظر آئی۔ دِلّی جہاں مسلمانوں کے کلچر کی چھاپ نمایاں ہے۔ بعض گلی کوچے اتنے تنگ اور پیچیدہ ہیں کہ ان پر بھول بھلیاں کا گمان ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندہ دلی، یہاں کی رونق، میلے ٹھیلے اور علم و ادب کے نادر نایاب موتی ضرب المثل ہیں۔

سین نمبر ا (مونتاژ)

سرِ شام دِلّی کی محرابی گلیوں میں روشن قندیلیں ۔۔۔ لوگ باگ بازاروں سے گزر رہے ہیں۔ اِس گہما گہمی میں دکان کے ایک تھڑے پر تین چار افراد بیٹھے باتوں میں مشغول ہیں ۔۔۔ ایک طرف کہار ہوادار (پالکی) اُٹھائے کسی رئیس کو منزل کی جانب لے جا رہے ہیں۔ اُس محرابی دروازے پر ایک فقیر سورداس نامی کاسہ لیے کھڑا ہے۔ جس کے سامنے سے ایک آدمی کاندھے پر اپنی دکان، ایک بڑا سا ٹکڑا اُٹھائے جا رہا ہے، جس کے پلڑوں میں اشیائے خورد و نوش برائے فروخت ہیں ۔۔۔ اُس کے پیچھے ہی ایک شخص پنجرہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے۔ وہ ایک لمحہ کو رُک کر فقیر سورداس کے کاسہ میں کوئی سکہ دھیلی یا دولا ڈالتا ہے ۔۔۔ مخالف سمت سے ماشکی چلا آ رہا ہے۔ جس کی کمر پر بھرا ہوا پانی کا مشکیزہ ہے ۔۔۔ رواں دواں زندگی ۔۔۔ (فیڈ اوٹ)

سین نمبر ۲

مغل بادشاہ شاہجہاں کے دَور کی عظیم الشان یادگار جامع مسجد کا آؤٹ ڈور ویو۔

دِلّی کی چلچلاتی دھوپ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں سے آگے راہ گزر پر ایک آدمی اونٹ کی مہار تھامے جا رہا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی گزر رہے ہیں اور ایک درخت کے سائے میں گھاس پر ایک مجذوب بیٹھا ہے اور پس منظر میں جامع مسجد کا پُرشکوہ منظر کیمرہ فوکس کر رہا ہے۔ پھر جمنا کنارے لال قلعے کا جاہ و جلال، جسے شاہجہانی عہد میں بادشاہ کے حکم پر مزدور پیشہ خاندانوں کے لاکھ ڈیڑھ لاکھ افراد نے تعمیر کیا تھا۔ قلعہ معلّٰی کے اس منظر میں سلو لائیڈ کے پردے پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجتی ہے جو کہ سہراب مودی کی ہے:

''1837ء مغل سلطنت کی راجدھانی دِلّی، پانڈوؤں کے زمانے سے اس وقت تک کئی بار

بسی اور کئی بار ویران ہوئی جسے انسان نے کبھی ۔۔۔قطب مینار (قطب مینار دکھایا جاتا ہے) انسانی دل میں اُٹھنے والے ولولے کی طرح آسمان کی طرف لپکتا اور کلام الٰہیہ میں گفتگو کرتا۔ جامع مسجد بھولے بھٹکوں کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔ لال قلعہ مغلیہ سلطنت کا مستحکم نشان، ہر عمارت ہر گلی کوچہ جوان تھا۔ پتھر اور چونے کے ہر ذرّے پر شباب تھا، لیکن افسوس انقلابات زمانہ کو اس کی ادا نہ بھائی اور مغل سلطنت کا سورج چار سو سال تک روشنی پھیلا کر اب غروب ہو رہا تھا۔ اس سورج کی آخری کرن، مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر ہے۔۔۔

(کیمرہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار کا منظر دکھاتا ہے۔ بادشاہ مسند پر بیٹھے ہیں، ریشمی پردے، فانوس، قیمتی قالین، درباری، جاہ و جلال۔۔۔ایک طرف ایک مصاحب مؤدب کھڑا ہے جس نے کوئی فرمان کھولا ہے)

جن کے دربار کی وقار میں خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق، جناب بالمقتدر حضور، حکیم مومن خان مومن، مفتی صدر الدین خان آزردہ، نواب مصطفےٰ خان شیفتہ، حکیم آغا جان عیش اور جناب محمد علی تشنہ جیسی شعر و شاعری کی کئی شمعیں روشن تھیں۔۔۔ان سے دُور ایک شمع تھی جو اپنی روشنی سے ہندوستان کا کونہ کونہ جگمگا دینا چاہتی تھی۔''

(کیمرہ کلوز)

سین نمبر ۳

پھر کیمرہ دِلّی کے کوچہ بلیماراں کی ایک نیم تاریک گلی قاسم جان کے ایک گھر میں داخل ہوتا ہے اور سلو لائیڈ پر ایک منظر دکھاتا ہے کتابوں کی الماری جس کے پٹ نیم وا ہیں۔ ایک فریم میں آویزاں قرآنی آیت لٹک رہی ہے۔ ساتھ دیوار گیر پر برتن ہیں۔ کیمرہ Move کرتا ایک شمعدان پہ آتا ہے جس میں ایک شمع روشن ہے۔ پاس ہی تخت پوش پر مرزا اسد اللہ غالب (بھارت بھوشن) بیٹھے ہیں، کسی آمدہ شعر کو گرہ باندھ رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے شعر کہتے ہیں۔

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

مرزا غالب کی بیوی امراؤ بیگم (نگار سلطانہ) یہ خاتون خانہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

امراؤ بیگم: ''جانے کہاں عاقبت کے بوریے بٹور رہے ہیں۔'' ماتھے پر ہاتھ مار کر کوستے ہوئے۔
''اللہ اللہ دِنوں کو غائب، راتوں کو غائب۔۔۔اتنا بھی تو نہ جانا کہ گھر میں بیوی ہے اُس کی بھی تو سن لے۔'' مرزا کے پاس جا کر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی۔'' کیوں جی! کیا اسی لیے آگرے سے یہاں آئے تھے کہ ہر وقت دوستوں ہی میں آوارگی کرتے رہیں۔۔۔اے بولتے کیوں نہیں۔آنکھیں تو چار کرو۔۔۔''

اور غالب شاعری کے شبستان میں ڈوبے شعر وضع کرتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے ہیں۔ اور ریشمی رومال کو گانٹھ بھی دیتے جا رہے ہیں۔ بیوی مرزا کو محو دیکھتی ہے تو یکدم روّیہ درست کر لیتی ہے۔

امراؤ بیگم: (معذرت خواہانہ) ''اللہ آپ تو شعر کہہ رہے ہیں۔۔۔'' دوسری جانب سے سامنے آ کر ''معاف کیجیے۔۔۔ مجھے معاف کیجیے۔'' اور دوپٹہ سر پر اوڑھتے ہوئے پیچھے ہٹتی جاتی ہے۔اُسی وقت باہر سے آواز آتی ہے۔

''امراؤ بیگم''

سین نمبر ۴

ایک بوڑھا شخص اچکن پہنے، سر پر ٹوپی، گلے میں مالا، کھونٹی کے سہارے بیرون دروازے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے دیوان خانے میں آ رہا ہے۔ اندرون خانے سے امراؤ بیگم دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آ رہی ہیں اور مؤدب ہو کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہتی ہیں:

''جی ابا جان!''

الٰہی بخش معروف: (کھونٹی ٹیکے سر ہلاتے ہوئے) پتہ چلا کہاں ہے تیرا نوشہ؟

امراؤ بیگم: وہ تو گھر میں ہیں۔ابا جانی۔۔۔

الٰہی بخش معروف: (حیرانی سے) ''ہیں!''

امراؤ بیگم: چار دن سے کہیں نکلے ہی نہیں۔

الٰہی بخش معروف: ''ہونہہ۔۔'' چل کر قریب آتے ہوئے سرزنش کے انداز میں۔'' شوہر کی طرف داری ضرور کر بیٹی لیکن اپنے باپ سے تو جھوٹ نہ بول۔۔۔ پانچ دن سے میں

نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ دیکھوں تو کیا کر رہے ہیں نواب صاحب۔''

امراؤ بیگم: مشاعرے کے لیے ہی غزل کہہ رہے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی اُنہیں گرہ لگاتے دیکھا ہے۔ (دونوں ہاتھوں سے فرضی گرہ لگاتی ہے)

باپ پلٹ کر قریب آتے ہوئے

الٰہی بخش معروف: ''تقدیر اپنی کو گرہ لگا رہا ہوگا۔ ایسا قسمت کا ہیٹا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا کیا موقع ہاتھ سے گنوا دیے اس نے۔'' ہاتھ ملتے ہوئے ''اگر یہی طور طریقہ رہا تو تجھے ایک بھٹیارن بنا کر چھوڑے گا۔۔۔ رہی سہی جائیداد بھی گنوا دے گا۔'' اور پلٹ کر جاتے ہوئے ''پھول ایسی بیٹی میں نے کس کے پلّے باندھ دی۔ زر بخت میں مَیں نے یہ کیا ٹاٹ کا پیوند لگا دیا!''

اِس اثناء میں مرزا غالب اندرون خانے سے نکلتے ہوئے زینے اُتر رہے ہیں اور آداب بجالاتے ہوئے۔

مرزا غالب: ''آداب عرض کرتا ہوں اباجان!''

الٰہی بخش معروف: آداب!۔۔۔ کہاں جا رہے ہیں آپ؟

مرزا جاتے ہوئے رُک جاتے ہیں۔

مرزا غالب: ''جی قلعے۔۔۔'' سر سے بھی اشارہ کرتے ہوئے ''آپ نہ جائیے گا مشاعرے میں!''

الٰہی بخش معروف: ''دیکھا جائے گا۔۔۔'' اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے مرزا کے قریب پہنچ کر طنزاً ''غزل ہو گئی آپ کی؟''

مرزا غالب: (انگلی میں انگوٹھی گھماتے ہوئے) جی غزل تو مقطع پر دم توڑ چکی۔

الٰہی بخش معروف: (حیرانی سے) ''ہیں؟''

مرزا غالب گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔ کیمرہ پاس کھڑی امراؤ بیگم کو کلوز کرتا ہے۔ جو دعائیں کر رہی ہیں۔ ''اے پاک پروردگار، میرے میاں کو کامیاب کیجیو'' اور آخری لفظ پر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔

سین نمبر ۵ (شاہی دربار کا منظر)

سنہری نقش و نگار سے سجی راہداری، ریشم واطلس وکمخواب سے مزیّن دربار، قیمتی فانوس لٹک

رہے ہیں۔ دونوں اطراف میں چوبدار کھڑے ہیں، شہر کے اُمرا اور شعر وادب کے لوگ مدعو ہیں، بگل بجتے ہیں۔ شہنشاہ عالی وقار والی ہند بہادر شاہ ظفر دربار میں تشریف لا رہے ہیں۔ آرائشی راہداریوں سے شاہی القابات کی صدائیں اُن کی آمد کی مدح سرائی میں گونج رہی ہیں۔

''با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔۔۔ نگاہ روبرو، فروغ خاندان عالی شانِ دڑانی۔۔۔ چراغ دودمانی شاہ سافرانی۔۔۔ حضرت ریاض الدین محمد ابوظفر کارخانی، شہنشاہ ہندوستان قدم رنجہ فرماتے ہیں۔''

وزیر مشیر، روسا و شعرا سب حاضرین احتراماً کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہلکا سا ''آداب'' کا شور بلند ہوتا ہے۔ بادشاہ تخت کے سامنے آکر کھڑے ہوکر''اجازت'' طلب کرتے ہیں۔ اہلِ دربار یک آواز ''بسم اللہ'' کہتے ہیں۔ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر (افتخار) کے رونق افروز ہوتے ہی سبھی تسلیم بجالاتے ہوئے محفل میں مڑھی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ موتیے اور گلاب کی معطر خوشبوؤں میں بادشاہ حکم صادر فرماتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: مشاعرہ شروع کیا جائے۔

شاہی اہلکار اعلان کرتا ہے: ''حاضرین! دیوانِ عام کے اِس غیر طرحی مشاعرے کی ابتدا ظلِ سبحانی کے کلام معجز نظام سے کی جاتی ہے۔'' آخری لفظ پر وہ اہلکار مؤدب بادشاہ کی جانب دیکھتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اپنا کلام عنایت کرتے ہیں۔ وہ اسے چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور اعلان کرتا ہے:

''نہایت ادب کے ساتھ گوشِ دل سے سماعت فرمایئے۔''

کیمرہ بادشاہ کی مسند کو کلوز لیتا ہے دو خدام پیچھے کھڑے بادشاہ کو مور چھل پنکھا جھل رہے ہیں۔ کٹ کر کے کیمرہ درباری اہلکار پر آتا ہے جو اُسے کھول کر ترنم سے پڑھتا ہے۔ (جو کہ گلوکار محمد رفیع کی آواز میں مترنم ہوا اور بغیر ساز کے)

ـــہ نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں
کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا

شعر کے اختتام پر داد کے لیے ''واہ'' اور سبحان اللہ کی آوازیں آتی ہیں۔

ـــہ غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا
کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

کیمرہ شعرا حضرات کی طرف جاتا ہے جہاں ''سبحان اللہ'' اور ''واہ واہ'' کی تکرار ہے۔

ے نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

''واہ واہ'' ۔۔۔''سبحان اللہ'' داد تحسین۔ بادشاہ کے چہرہ پر تبسم کھیل رہا ہے۔

ے ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
ہو وہ کیسا ہی فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل کے مقطع کے بعد ''واہ واہ'' کا اک شور بلند ہو جاتا ہے۔ اِن آوازوں میں اعلان ہوتا ہے۔ ''ناظرین! اب شمع محفل عالی جناب مفتی صدر الدین خاں آزردہ (مراد) کے سامنے لائی جا رہی ہے۔ حضرت آزردہ کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔''

ایک درباری شمع مفتی صاحب کے آگے رکھ کر کورنش بجالاتے ہوئے ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اُن کے ساتھ مومن خاں مومن بیٹھے ہیں اور دوسری جانب بالمقابل حضور براجمان ہیں مفتی صدر الدین ''اجازت'' طلب کرتے ہیں۔ ''ارشاد، ارشاد'' کی آوازیں آتی ہیں۔

آزردہ: مطلع عرض کرتا ہوں۔

ع نالوں سے میرے کب تہہ و بالا جہاں نہیں

حاضرین میں سے کچھ مصرع دہراتے ہیں۔۔۔

ع کب آسمان زمین، زمین آسماں نہیں

آزردہ کے ہاتھ سے زمین و آسمان کے اشارہ پر حکیم مومن خاں مومن بے خود ہو کر ہاتھ بڑھا بڑھا کر داد دیتے ہیں۔

آزردہ آداب بجالاتے ہوئے لوگوں کی داد وصول کرتے ہیں۔

ے کہتا ہوں منہ سے کچھ میں، نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے زباں اور زباں نہیں

شعراً حضرات دونوں مصرعے دہراتے ہیں اور ''بہت اچھے'' اور ''سبحان اللہ'' کے آواز ے بھی بلند کرتے جاتے ہیں۔۔۔

اعلان : جناب لالہ بالمقند حضور

؎ نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت
جو اُٹھ کھینچ دامن ہم اس دلربا کا

پہلے مصرعہ پر بھی ''سبحان اللہ'' اور دوسرے پر بھی ''واہ واہ'' شاعر بالمقند آداب بجالاتے ہیں۔

؎ سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے
کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

حاضرینِ مشاعرہ پہلا مصرع دوبارہ پڑھتے ہیں ''جواب نہیں ہے استاذ'' اور دوسرے مصرعے کو دہرا کر ''سبحان اللہ۔۔۔ واہ واہ''

شمع اب حکیم مومن خاں مومن کی جانب آتی ہے۔ نقابت کرنے والے کے اعلان کے بعد حکیم مومن خاں مومن دایاں بازو لہرا کر ترنم کے ساتھ غزل سرا ہوتے ہیں۔

؎ اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

شعراداد دیتے ہوئے ''آہا۔۔۔ سبحان اللہ''

؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

صدر الدین آزردہ پہلا مصرع دہراتے ہیں۔ ''سبحان اللہ بھئی سبحان اللہ۔'' مومن خاں مومن آداب بجالاتے ہوئے حاضرین سے بھی ''واہ واہ۔۔۔ سبحان اللہ سبحان اللہ'' کی داد وصول کرتے ہیں۔ حکیم مومن خاں مومن کی خوش الحانی کے بعد نقابت کرنے والا آواز ہ لگاتا ہے:

''حاضرین جگر تھام کے بیٹھو کہ میری باری آئی۔ شمع محفل خاقانی ہند، ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق، استادِ شاہ کے سامنے لائی جارہی ہے۔ ہمہ تن گوش ہو کر سنیے۔''

استاد ذوق (الہاس) ترکی ٹوپی پہنے ہوئے، ہاتھ میں تسبیح ہے۔

ابراہیم ذوق: مطلع عرض کیا ہے پیرو مرشد۔۔۔ (کیمرہ بہادر شاہ ظفر پر آتا ہے)

بہادر شاہ ظفر: اجازت ہے:

ے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

استاد ذوق دوسرے مصرعے کے جب۔۔۔"تو کدھر جائیں گے۔" کو ادا کرتے ہیں تو حاضرینِ محفل زور سے ہم آواز "تو کدھر جائیں گے" کا شور بلند کرتے ہیں۔ پان کی گلوریوں میں ہر طرف "واہ واہ" اور داد وتحسین کا منظر ہے۔ کیمرہ اب شعرا حضرات میں بیٹھے ہوئے مرزا غالب پر بھی آتا ہے جو ذوق کا مصرع دہرا رہے ہیں۔

ع مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا سر ہلاتے ہوئے بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

ے ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھ سے

بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

درباریوں اور ذوق کے شاگردوں میں۔۔۔"واہ واہ" مچ گئی۔ بلکہ کچھ شاگرد تو اُٹھ اُٹھ کر ہاتھ آسمان کی طرف کر کے، آگے بڑھ بڑھ کر داد دیتے ہیں اور کافی دیر" بھئی واہ، بھئی واہ" کی تکرار رہتی ہے۔

آواز "ارشادِ ظلِ سبحانی"

کیمرہ بہادر شاہ ظفر پر آتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر: سبحان اللہ استاد

ذوق تسلیمات بجالاتے ہیں اور ماحول میں داد وتحسین کی پھلجھڑیاں کوند گئیں۔ داد کا شور وغل تھما تو نقابت کرنے والا اعلان کرتا ہے۔ "اب جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب"

کیمرہ ذوق پر آتا ہے۔

ابراہیم ذوق: "یعنی مرزا نوشہ، المتخلص غالب"

کیمرہ غالب کو کلوز اَپ کرتا ہے۔

مرزا غالب: لو صاحبو! میں بھی اپنی بھیروی الاپتا ہوں۔

صدر الدین آزردہ: ارشاد

ایک آواز: ہاں بھئی تم بھی شروع کرو اپنی شام کلیان

مرزا غالب:	مطلع عرض ہے

آزردہ:	فرمائیے۔

مرزا غالب: ؎ ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت ، تو گزرتا ہے گماں اور

آزردہ:	سبحان اللہ، سبحان اللہ

نواب شیفتہ:	کیا کہنے کیا پیارا مطلع ارشاد فرمایا، سبحان اللہ

مرزا غالب آزردہ کی طرف دیکھتے ہوئے آداب بجالاتے ہیں۔ آواز آتی ہے۔ ''کیا کہنے، خوب''، باقی سامعین میں خاموشی چھائی رہی۔

؎ یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو ، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

''واہ'' آزردہ کی آواز آتی ہے۔ وہ مصرع دہراتے ہیں۔ ''بہت خوب، بہت خوب'' صرف آزردہ اور شیفتہ کی دو آوازوں سے ہی اُنہیں داد ملتی ہے۔ خاص طور سے ذوق کے شاگرد ان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اُنھیں شعر کی سمجھ نہیں آئی۔ کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ مشاعرے پر سکوت کی فضا ہے۔ ایسے میں شہر کوتوال حشمت خاں (جگدیش سیٹھی) دیوانِ عام میں کھڑے مرزا کا کلام سُن رہے ہیں۔ اس کے کلوز شارٹ کے بعد کیمرہ مرزا غالب پر آتا ہے۔

مرزا غالب:	''کیا نا قدردانوں کی محفل ہے'' (اس ناقدری پر بڑبڑا کر مرزا اگلا شعر پڑھتے ہیں)

؎ ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ایک آواز:	''ہم یہ خودستائی نہیں سننا چاہتے۔''

''خودستائی، خودستائی'' ان آوازوں کا حاضرین میں شور بلند ہوتا ہے کہ ''سمجھ نہیں آئی کیا کہہ رہے ہیں۔''

مرزا غالب:	لعنت ہے اس اندازِ بیاں پر۔

مرزا زچ ہو جاتے ہیں اس سلوک پر۔ شمع کسی اور طرف چلی جاتی ہے۔ مرزا ٹوپی اُتار لیتے ہیں۔

مرزا غالب:	(آزردہ سے مخاطب ہو کر) میں ابھی اُٹھوں گا۔

آزردہ: یہ شاہ کی توہین ہے مرزا نوشہ! (سمجھانے والے انداز میں)

مرزا غالب: میری توہین کا خیال آپ کو نہیں!

یہ کہہ کر اُٹھے کورنش کی، اور محفل چھوڑ کر نکل گئے۔ حاضرین کی ہنسی اُن کے تعاقب میں تھی۔

سین نمبر ۶ (آؤٹ ڈور، رات کا منظر)

مرزا قلعہ معلّٰی کی راہداری سے باہر کی طرف آتے ہیں۔ اُن کا ملازم کلّو داروغہ وہاں ہے۔ چلتے ہوئے کہتے ہیں:

مرزا غالب: چلو کلّو میاں۔

کلّو: کہاں؟ (حیرانی سے)

مرزا غالب: جہاں کہیں بھی لے چلو، لیکن یہاں سے چل دو۔ اِن جاہلوں اور ناقدر دانوں کی محفل سے دُور (اور ہوادار میں بیٹھتے ہوئے) بہت دور۔

کلّو: (پالکی کہاروں کے ساتھ) اُٹھاؤ بھیا، سنبھال کے۔۔۔ داہنہ کاندھ (اُٹھاؤ) ہاں، بچ کے۔

کہار ہوادار اُٹھائے رواں دواں ہو جاتے ہیں۔

سین نمبر ۷ (سنسان گلی کوچے)

رات کی خاموشی میں پالکی آتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ ایک محرابی دروازے میں سے گزرتے ہیں۔ بازار ویران ہیں اندھیرے میں دو چار پائیوں پر آدمی سو رہے ہیں۔ پس منظر میں قدن میاں کی سارنگی کی آواز ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ مرزا غالب کہاروں کو آواز کی جانب مڑنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ایک بالا خانے سے موتی عرف چودھویں بیگم (ثریا) کی نغمہ بار صدا گونجتی ہے۔

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے؟ تو چھپائے نہ بنے
مَیں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

مرزا کی سواری بالا خانے کے باہر پہنچ جاتی ہے۔ طوائف زادی چودھویں، کسی بے نام سی خوشی میں لپٹی بالکونی میں جلوہ افروز اپنی دھن میں گارہی ہے۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مرزا ہوادار سے اُتر آئے اور کھڑے سن رہے ہیں۔ چہرے پر عجیب سی کشمکش کے تاثرات ہیں۔ پھر وہ مکان کے دروازے تک جاتے ہیں۔ دستک بھی دے دیتے ہیں مگر لوٹ آتے ہیں۔ لیکن پھر جی میں آتا ہے دوبارہ ''دستک'' دیتے ہیں۔ بالا خانے کی سیڑھیاں اُترتا گھر کا خدمت گار قدن آ رہا ہے۔ بلکہ رات کے اُس پہر، بے سکوں اور مضطرب چودھویں خود دروازے پر آتی ہے۔ پٹ کھلتے ہی ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے گھونگھٹ نکال کر پوچھتی ہے:

چودھویں بیگم: کون ہیں آپ؟۔۔۔ کسے چاہتے ہیں آپ؟؟

مرزا غالب: چاہتا کسی کو نہیں، ملنا چاہتا ہوں۔ البتہ کون ہے موتی؟

پیچھے بالکونی میں چودھویں کی ماں ملکہ جان (درگا کھوٹے) کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عقب میں اماں کی طرف دیکھتے ہوئے چودھویں کہتی ہے۔

چودھویں بیگم: کوئی ملنا چاہتے ہیں اماں!

ملکہ جان: کس سے ملنا چاہتے ہیں؟

چودھویں بیگم: کس سے ملنا چاہتے ہیں؟ (ماں کا فقرہ دہلیز پر کھڑے مرزا سے دہراتی ہے)

مرزا غالب: جو کوئی مرزا کی غزل گا رہا تھا۔

چودھویں بیگم: کہتے ہیں جو کوئی مرزا کی غزل گا رہا تھا۔

کیمرہ بالکونی میں کھڑی اماں کو فوکس کرتا ہے۔

ملکہ جان: (فکر مندی سے) ہائے نوش، کون ہے، کیسا آدمی ہے، اتنی رات گئے کون شریف آدمی کسی کے ہاں آتا ہے۔

چودھویں بیگم: (گھونگھٹ کا پلو درست کرتے ہوئے) اماں کہتی ہیں اتنی رات گئے کون شریف آدمی کسی کے ہاں آتا ہے۔

مرزا غالب: جی میں بھی شریف ہی آدمی ہوں۔۔۔ شاعر ہوں۔ شاہی مشاعرے سے لَوٹ رہا ہوں۔

چودھویں بیگم: (خوشی اور حیرت سے، گھونگھٹ سے کچھ بے نیاز) ''شاہی مشاعرے سے لوٹ رہے ہیں آپ، مرزا نوشہ کا کلام سنا ہوگا آپ نے۔ وہ وہاں پڑھنے والے تھے۔'' ایک ہی سانس میں ہیجانی کیفیت میں کہتے ہوئے ''آیئے باہر کیوں کھڑے ہیں۔ تشریف لایئے۔''

چودھویں بیگم گھونگھٹ اور خوشی کی کشمکش میں آگے چلتی ہے۔ مرزا غالب پیچھے آ رہے ہیں۔

چودھویں بیگم: ''آپ بچی مشاعرے سے آرہے ہیں۔'' خوشی اور بے یقینی میں چلتے چلتے پیچھے مڑ کر ''مرزا جی کا کلام سنا آپ نے؟۔۔۔ اُن کی زبانی سنا!!۔۔۔ کیسی آواز ہے اُن کی؟ کیسا پڑھتے ہیں؟؟ ترنم سے پڑھتے ہیں؟؟؟۔۔۔ حضور بادشاہ سلامت تو بہت خوش ہوئے ہوں گے۔''

قدموں میں تیزی، چہرے پر تابانی اور آواز پُر تجسس، یہ سب دیدنی۔۔۔ پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔

چودھویں بیگم: ''بہت ہی داد ملی ہوگی اُن کو، مشاعرہ اُڑا کے رکھ دیا ہوگا مرزا جی نے۔'' زینے طے کرتے ہوئے بھی پیچھے مڑ کر ''کوئی ٹھہرا بھی نہ ہوگا اُن کے سامنے۔۔۔ اوہ معاف کر دیجیے گا میں نے آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔'' وہ اوپر اختتامی زینے پر اور مرزا ابھی سیڑھیاں طے کر رہے ہیں۔

سین نمبر ۸ (بالاخانے کا اندرون)

بڑا کمرہ جس میں موم بتی جل رہی ہے۔ دیوار کے ساتھ مہمانوں کے لیے نشست اور دوسری طرف بھی بیٹھنے کے لیے ایک گدا ز تخت پوش جس کے آگے ایک میز ہے۔ چودھویں آراستہ پیراستہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ ''آیئے'' مرزا بھی پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

چودھویں بیگم: ''آیئے، آیئے، تشریف رکھیے۔''

مہمان خانے میں ماں بھی موجود ہے۔ مرزا بڑی اماں کو ہاتھ سے آداب کرتے ہیں۔ وہ بھی جواباً اشارہ کرتی ہیں۔ مرزا ایک طرف تخت پوش پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چودھویں بھی بیٹھ جاتی ہے۔

چودھویں بیگم: (اضطراری انداز میں) ''آدمی کیسے ہیں مرزا صاحب، میرا مطلب ہے دیکھنے میں کیسے ہیں؟ مزاج کے کیسے ہیں؟؟ (اور معصومیت سے گھورتے ہوئے) ارے آپ تو کچھ کہتے ہی نہیں!''

مرزا غالب: کہنے کی مہلت بھی تو دیں۔

چودھویں بیگم: ''اوہ، فرمایئے نا'' (اشتیاق سے)

مرزا غالب: ہاں تو میں مشاعرے سے لوٹ رہا ہوں۔ میں نے مرزا جی کا کلام سنا۔ پڑھتے اچھا ہی ہیں اور۔۔۔

چودھویں بیگم: (بے صبری سے کھڑے ہو کر) سنا اماں، میں نہ کہتی تھی۔۔۔

مرزا غالب: ''صورت میں بڑی نرمائی ہے۔ چمپئی رنگ ہے۔ لامباقد، کھلے ہاتھ پاؤں۔'' اور دونوں ہاتھ کھول کر ''مزاج کے تند خو ہیں، جلد روٹھیں، دیر سے منیں۔۔۔''

چودھویں بیگم: جھوٹ، بالکل جھوٹ۔۔۔ (بات کاٹ کر بائیں ہاتھ میں دوپٹے کا پلو مسلتے ہوئے)

مرزا غالب: آپ تو یوں کہتی ہیں جیسے دیکھا ہو مرزا کو۔۔۔ (اٹھ کر چودھویں بیگم کے پاس جا کر)

چودھویں بیگم: دیکھا نہیں تو کیا، پڑھا سنا بھی نہیں!۔۔۔ ہائے اللہ کتنے اچھے شاعر ہیں۔ میرا بس چلے تو نگر نگر ڈھنڈورا پیٹتی پھروں اُن کا۔ (پلٹتے ہوئے)

مرزا غالب: یہ بات ہے، کہیے تو بلوادوں؟

چودھویں بیگم: ''ہاں، ہم ٹھہرے، غریب ڈوم لوگ، وہ ہم سے کیوں ملنے کے۔'' باہر کھڑکی کی جانب گھومتے ہوئے۔ ''اُنہیں تو ہمارا پتہ بھی نہ ہوگا۔ یہ انہی کا شعر ہے نا۔۔۔ (ترنم سے گنگناتے ہوئے)

ع ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

خاک ہو جائیں گے ہم۔۔۔ اس پر کٹ کر کے کیمرہ بڑی اماں پر آتا ہے۔

ملکہ جان: ہائے میری توبہ یہ لڑکی کیا کرتی ہے۔ گر محلے میں کوئی سن لے تو کیا کہے۔

مرزا غالب: ''اپنی اپنی پسند کی بات ہے بڑی بی۔ ہم بھی ایک چھوٹے سے شاعر ہے۔۔۔ بلکہ یوں کہیے شاعر۔۔۔'' چلتے ہوئے چودھویں بیگم کے پاس جا کر ''فرمایئے تو کچھ عرض کروں۔ (اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے)

چودھویں بیگم: (سہمی ہوئی) ارشاد۔

مرزا غالب: عرض کیا ہے

ؔ ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت ، تو گزرتا ہے گماں اور

(چودھویں کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک ادا سے)

چودھویں بیگم: ''اچھا ہے۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف چل دیتی ہے۔

ؔ یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دِل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بڑی اماں کے سامنے میز پر پڑے پڑی ہے۔ گلاس کے ساتھ طشتری میں خاصدان میں چاندی کے ورق لگے پان پڑے ہیں۔ چودھویں طشتری اُٹھا کر مرزا کو پیش کرتی ہے۔

چودھویں بیگم: لیجیے! پان تو کھائیے۔

مرزا غالب: ''بس ایسے ہی ہیں، آپ کو تو ہمارے شعر پسند نہیں آتے ہم البتہ۔۔۔'' جیب سے اشرفی نکال کے طشتری میں رکھتے ہوئے پان اُٹھا کر''اس گلوری کی داد دیتے ہیں۔''

چودھویں بیگم: جی ایسی بات نہیں۔ شعر خاصے ہیں آپ کے۔۔۔ آپ خود سمجھدار ہیں مرزا جی کی بات ہی اور ہے۔ (پلیٹ میز پر رکھ دیتی ہے)

مرزا غالب: ''ہوگی، ہم تو اتنا جانتے ہیں۔۔'' گلوری منہ میں رکھ کر'' اُن کے باپ دادا بندوق چلاتے تھے۔۔۔ مرزا ابھی لٹھ مار ہوں گے۔''

چودھویں بیگم: معاف کیجیے۔ میرے سامنے تو ایسی باتیں نہ کیجیے۔ (شکایت بھرے انداز میں)

مرزا غالب: اُن کو تو چاہیے وہی باپ دادا کا پیشہ اختیار کرلیں۔ شاعری اُن کے بس کا روگ نہیں۔

چودھویں بیگم: (غصے سے) آپ تشریف لے جایئے۔

مرزا غالب: جی۔

چودھویں بیگم: (باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں کہتی ہوں آپ تشریف لے جایئے۔

مرزا غالب باہر نکل جاتے ہیں۔ چودھویں دروازے تک پیچھے ہے۔ مگر دروازہ بند نہیں کرتی۔ واپس پلٹتے ہوئے دہراتی ہے۔

چودھویں بیگم: شاعری اُن کے بس کا روگ نہیں، بڑا آیا شعر سمجھنے والا، آنکھوں کے اندھے نام

سین نمبر۹ (بالا خانے کا بیرونی منظر)

مگر مرزا خوشگوار موڈ میں کوٹھے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے نچلے زینے پر رُک کر۔

ــــہ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مرزا صحن میں چلتے ہوئے دو دفعہ پیچھے مڑ کر گھر کو بھی دیکھتے ہیں۔

سین نمبر۱۰

بیرونی دروازے کی دہلیز پر پہنچ کر وہ رُک جاتے ہیں۔ کیونکہ ہاتھ میں چھڑی پکڑے کوتوال حشمت خان آ رہا ہوتا ہے۔ مرزا کی طرف دیکھتا ہے دونوں کا دروازے پر ٹاکرا ہوتا ہے۔ حشمت خان پھر گھور کر مرزا کو دیکھتا ہے اور اندر چلا جاتا ہے۔

سین نمبر۱۱ (چودھویں بیگم کا کمرہ)

ملکہ جان: کچھ بھی ہو مہمان تھا ہمارا۔

چودھویں بیگم: ''نہیں چاہیے ہمیں ایسے مہمان ۔۔۔ دیدہ دلیری تو دیکھو۔ ہمارے سامنے بیٹھ کر مرزا کی برائی کرتے ہیں۔'' ہاتھ نچاتے ہوئے'' دھکا دے دیتی میں تو اوپر سے۔ (غصے سے بھری ہوئی طشتری میں سے سکہ جو غالب نے دیا تھا اُٹھا کر پھینک دیتی ہے جس کی کھنک فرش پر سنائی دیتی ہے۔ اسی اثناء میں حشمت خاں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ چودھویں بیگم اُسے دیکھ کر دوپٹہ درست کرتی ہے اور موڈ تبدیل کر کے تیزی سے اُس کی طرف آتی ہے)

چودھویں بیگم: کوتوال صاحب۔۔۔ لائیے مرزا کی غزل (ہتھیلی پھیلاتے ہوئے)

حشمت خاں: اب بھی ضرورت رہ گئی مرزا کی غزل کی؟

چودھویں بیگم: (چونکتے ہوئے) کیا مطلب؟ ضرورت کیوں نہیں!

حشمت خاں: ''مرزا خود ہی یہاں مرا جنے لگے ہیں۔'' (گردن موڑ کر بداعتمادی سے چودھویں کو دیکھتا ہے چودھویں جو حیران کھڑی ہے)

حشمت خاں: ''پھر غزل کیسی؟'' طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے''مبارک ہواُن کا آپ کے ہاں آنا'' اشارہ بڑی بی کی طرف تھا۔

چودھویں بیگم: ''مرزا کا ہمارے ہاں آنا، گھاس تو نہیں کھائی ہے آپ نے؟'' اور ماں سے مخاطب ہو کر''ارے اماں! سنا بھی ہے کیا کہتے ہیں قبلہ کوتوال صاحب!''

ملکہ جان: بیٹے جی، ہم تو اُن کی شکل تک نہیں پہچانتے۔

حشمت خاں: تو یہ قصہ کیا ہے۔ میں نے خود مرزا کو آپ کے ہاں سے نکلتے دیکھا ہے۔

ملکہ جان: بھوت ہوگا مرزا کا۔

چودھویں بیگم: ''کیسی باتیں کرتی ہو اماں، اُن کا بھوت کیوں ہوگا خدا کرے۔۔۔ اُنہیں تو خواجہ خضر کی حیات دے اللہ'' اور حشمت کی طرف ہاتھ پھیلا کر''لایئے مرزا کی غزل'' حشمت بغور اُسے دیکھتے ہوئے غزل دیتا ہے جو اُسی کی فرمائش پر وہ مشاعرے سے لکھ کر لایا تھا۔ چودھویں پلنگ پر اطمینان سے بیٹھ کر اشتیاق سے اُس صفحہ کو کھولتی ہے اور مصرعہ پڑھتی ہے۔

ع ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور

مصرعہ پڑھ کر حیران رہ جاتی ہے۔''ہائے اللہ'' کہہ کر پلنگ سے اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

سے ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

گومگوں کی حالت میں شعر پڑھتی ہے، ہائے اللہ کہہ کر رخسار پر ہاتھ رکھ کر پکارتی ہے۔''مرزا جی، مرزا جی'' یہ کہتے کہتے بالکونی کی جانب لپکتی ہے۔ یہاں بھی زباں سے نکلتا ہے۔''مرزا جی'' بازار میں کوئی نہیں، مرزا جا چکے تھے۔

''اماں''، بے بسی سے ماں کو آواز دیتے ہوئے واپس کمرے میں آتی ہے۔

چودھویں بیگم: ''اللہ جی، مجھے تھام لو اماں جانی! یہ میں نے کیا کر دیا۔'' ماں کے گلے لگ کر''کیا کچھ کہہ دیا مرزا جی کو۔۔۔ مرزا آئے اور خفا ہو کر چلے گئے۔ مجھ جیسا بدقسمت بھی کوئی ہوگا''۔ بے چینی میں ادھر ادھر قدم رکھتے ہوئے۔''خدا خود جس کے دروازے پر آیا، اُس نے اسے لوٹا دیا۔ نہ اُٹھایا، نہ بٹھایا، نہ راہ میں آنکھیں

بجھائیں، ایسے لوگ روز روز نہیں آتے اماں۔۔'' اور ماں کو ٹہوکا دے کر ''یہ بھی کوئی چاند سورج ہیں جو روز نکلیں اور روز ڈوب جائیں۔''

اُس کی نگاہیں نیچے فرش پر تھیں کہ اچانک چہرے پر خوشی اُمڈ آتی ہے۔ کیمرہ فرش پر گرے ہوئے اُس طلائی سکے کو دکھاتا ہے جو مرزا نے دیا تھا۔ وہ اُس کے قریب جا بیٹھتی ہے۔ سکہ اُٹھاتی ہے اور سینے سے لگا لیتی ہے۔

سین نمبر ۱۲ (گلی قاسم جان میں، مرزا کے گھر کا صحن)

مرزا غالب صبح کاذب گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ دیوان خانے میں دینی آیات پڑھنے میں مصروف اپنے بوڑھے خسر الٰہی بخش معروف کو آداب کرتے ہیں۔

مرزا غالب: آداب عرض ہے اباجان۔

الٰہی بخش معروف: ''جیتے رہو'' حقے کی نے ایک طرف کر کے ''میاں ٹھہرو، یہ سویرے آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟''

مرزا غالب: (اندر جاتے ہوئے مُڑ کر) جی، مشاعرے سے۔

الٰہی بخش معروف: ''وہی جو رات ایک بجے ختم ہوا ہے۔'' ہاتھ ہلا کر ''اب صبح ہو رہی ہے۔ کہاں رہے اتنی دیر؟''

مرزا غالب: (سہمے ہوئے انداز میں) جی دوست مل گئے، باتیں ہوئیں۔۔۔ دیر ہوگئی۔

الٰہی بخش معروف: ''ہونہہ، چہ خوب۔۔۔'' چہرے پر ناگواری کے تاثرات ''اچھا اتنا تو بتایئے مشاعرے میں کیا خاک اُڑائی آپ نے؟''

مرزا غالب: جی خاک بھی نہیں ملی، خاک اُڑانے والے وہاں اور کم تھے!

خسر ''ہونہہ'' کہہ کر حقے کی نے کو جھٹکتے ہوئے کتاب بند کرتے ہیں۔

سین نمبر ۱۳ (اندرون خانہ)

مرزا اندر داخل ہو کر گلا کھنکارتے ہیں۔ مرزا کی قرآن سخن بیوی امراؤ بیگم، کلام مجید کو غلاف میں لپیٹ کر رحل پر رکھ رہی ہیں۔

امراؤ بیگم: یہ ہونہہ کیا لگا رکھی ہے۔۔۔ آئے ہیں تو آ بھی جایئے۔

مرزا غالب: ''آتا ہوں حضور، جوتا اُتار لوں تو گھر میں داخل ہوؤں۔۔۔ ساری رات یہاں

تہجد پڑھی گئی۔'' دیکھ بھال کر پاؤں رکھتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں۔'' کہیں مصلہ بچھا ہے، کہیں رحل رکھی ہے، کہیں وضو کی چوکی ہے۔۔۔ گھر بھر مسجد بنا ہوا ہے۔'' ٹوپی تخت پوش پر پھینک کر ''مَیں گناہ گار آدمی ہوں، بھلا ایک عابدہ زاہدہ بی بی کے ہاں جوتے سمیت کیسے گھس آؤں۔'' (یہ کہہ کر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

امراؤ بیگم: (چل کر قریب آتے ہوئے) ''نخرے نہ بگھاریے، سچ بتایئے دعائیں قبول کر لیں میری اللہ میاں نے۔'' (اور تخت پوش پر ساتھ بیٹھ جاتی ہیں)

مرزا غالب: وہ آپ جانیں اور آپ کے اللہ میاں۔

امراؤ بیگم: (مرزا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) دشمن ہو گے جو نہ بتاؤ گے، مشاعرے میں کامیابی ہوئی؟

مرزا غالب: بہت۔

(امراؤ بیگم ہاتھ جوڑ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں)

مرزا غالب: غزل کیا پڑھی بیگم، مشاعرے بھر کو سانپ سونگھ گیا۔۔۔ داد دینے والے دو ہی فرد تھے، مفتی صاحب اور نواب شیفتہ۔۔۔

(بیگم نے مرزا کا کندھا پکڑا ہوا ہے چہرے پر اضمحلال ہے)

مرزا غالب: خدا انہیں سلامت رکھے (یہ کہہ کر مرزا اُٹھ جاتے ہیں، بیگم بھی حیران سی کھڑی ہو جاتی ہے)

امراؤ بیگم: تو کیا آپ کے دشمنوں کو۔۔۔

مرزا غالب: (بیچ میں بات اُچکتے ہوئے) دشمنوں کو نہیں بی بی، مجھے ہی ناکامیابی ہوئی ہے اور بہت بری ہوئی۔۔۔ وہاں سے رات گئے آیا تو یہاں ابا جان نے دم پخت کر دیا۔

امراؤ بیگم: ابا جان کی باتوں پر نہ جایئے۔ یہ تو اُن کی عادت ہی ہے۔

مرزا غالب: ''ٹھیک ہے بیگم! مگر اب میں یہاں نہ رہوں گا۔ پہلے ہی میاں کالے صاحب اپنی حویلی میں اُٹھ آنے کو کہہ رہے تھے۔'' بیگم کی پریشان سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ''تم کیا کہتی ہو!'' (مرزا پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں)

امراؤ بیگم: ''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' یاسیت بھرے لہجے میں ''جہاں جائیں گے میں بھی چلی

چلوں گی۔" (بیٹھتے ہوئے مرزا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) "قدموں سے لگی رہوں گی آپ کے۔"

مرزا غالب: (بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وفورِ محبت سے) "بیگم! ایک تم نہ ہوتی تو نہ جانے میں اپنے آپ کو کیا کر بیٹھتا۔"

امراؤ بیگم ساتھ چپکتے ہوئے سر مرزا کے کندھے پر رکھ دیتی ہے۔

سین نمبر ۱۴ (شاہ نصیر الدین عرف میاں کالے شاہ صاحب کی حویلی)

غالب کے قدر داں میاں کالے شاہ کی طرف سے بغیر کرایہ رہائش گاہ کی آفر تھی۔ کافی بڑی حویلی، داخلی دروازے کے دائیں جانب ایک بڑا سا کبوتروں اور مرغیوں کا ڈربہ ہے۔ مرزا کا ملازم کلو میاں وسیع و عریض صحن میں کھڑا مزدور آدمیوں سے سامان رکھوا رہا ہے۔ جو باہر سے سامان اندر لا رہے ہیں۔

کلو: چل ننھے۔۔۔

ننھا بقیہ اسباب لینے باہر نکل جاتا ہے اور ایک دوسرا خادم پنجرہ تھامے اندر آ رہا ہے۔

کلو: "لا" اور پنجرہ اُسے پکڑا دیتا ہے۔ "شاباش، شاباش"

ننھا چارپائی لیے اندر داخل ہوتا ہے اور ایک آدمی بکریاں لیے اُس کے پیچھے ہی آ رہا ہے جو قابو نہیں آ رہیں۔

کلو: اے بکری۔۔۔ اِس میں بھونچال آ گیا ہے۔

امراؤ بیگم زنان خانے میں ہیں۔ یہ لوگ مال اسباب اندر منتقل کر رہے ہیں۔

کلو: جلدی جلدی، شاباش شاباش

کالے شاہ صاحب صحن کے بیچوں بیچ تخت پوش پر تشریف فرما، حقے کی نے منہ میں دبائے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ سرکنڈوں کے بنے موڑھے پر پاس مرزا غالب بیٹھے ہیں۔

مرزا غالب: میری بیگم بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔

کالے شاہ صاحب: اور کہو کچھ روپے پیسے کی ضرورت؟

مرزا غالب: جی شکریہ! اللہ کا فضل ہے شاہ صاحب! انگریز سرکار سے دو ہزار روپیہ مل جاتا ہے۔

گزر رہو جاتی ہے، پھر آپ کی دعا سے آگر ے میں کچھ جائیداد اور املاک بھی ہے۔

اس اثناء میں داخلی دروازے سے متھرا داس مہاجن (مکری) بہی کھاتا سنبھالے چلا آرہا ہے۔ مرزا دیکھ رہے ہیں۔

متھرا داس: بندگی عرض کرتا ہوں (ہاتھ جوڑ کر خوشامدی انداز میں)

مرزا غالب: اوہو، متھرا داس!

متھرا داس: (مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے) حضور وہ پچھلا حساب۔۔۔

مرزا غالب: (جلدی سے) ''اوہ میں سمجھا، سمجھا۔۔۔'' کالے شاہ صاحب سے مخاطب ہو کر۔ ''کالے صاحب قبلہ امَیں ابھی حاضر ہوا۔''

متھرا داس: رکو ذرا (باآواز بلند)

مرزا غالب: ''آہستہ بولو لالہ'' اُسے ساتھ لیے متفکر سے ذرا فاصلے پر''مَیں آپ کی پائی پائی چکا دوں گا، اطمینان رکھو!''

متھرا داس: ''اطمینان میں خاک رکھوں'' بے اعتنائی سے ''کُل دو قسطیں بھجوائی تھیں آپ نے۔ اِس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے، آپ نے ایک پائی نہیں دی۔''

مرزا غالب: لالہ ہمارے ہاں کہتے ہیں اگر کوئی کسی کا تانبے کا پیسہ بھی رکھتا ہے تو اللہ کے حضور میں اُسے سونے کی اشرفی دینی پڑتی ہے۔۔۔ اب تمہیں فکر کس بات کی!

متھرا داس مہاجن آنکھیں ترچھی کیے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔

متھرا داس: پھر کہہ دی نہ آپ نے شاعروں والی بات۔۔۔ ارے بھائی مجھے اللہ کے پاس تھوڑی جانا ہے، مجھے تو جانا ہے بھگوان کے پاس۔

مرزا غالب: ''اوہ۔۔۔'' ہنستے ہوئے ''اچھی بات ہے لالہ جہاں مرضی چاہو چلے جانا۔

متھرا داس: پھر کب حاضر ہوؤں؟

مرزا غالب: ''ابھی تو بخشو، ابھی چلے تو جاؤ میرے بھائی پھر حاضر بھی ہو جانا'' اُسے باہر والے دروازے کی جانب لے جاتے ہیں اور مہاجن کو رخصت کر کے کالے شاہ صاحب کی طرف پلٹتے ہیں۔

کالے شاہ صاحب: تو مرزا نوشہ یہ مہاجن کیسے آئے؟

مرزا غالب: یونہی آگرے کے پرانے دوست ہیں، کچھ پیسے ان کے پاس جمع کر رکھے تھے کہہ رہے تھے واپس لے لو، سود بہت ہو جاتا ہے۔

امراؤ بیگم چلمن کی اوٹ سے یہ سب تماشا دیکھتے ہوئے متفکر ہیں۔

کالے شاہ صاحب: (اپنائیت سے مرزا کا کاندھا دباتے ہوئے اُٹھ کر) اچھا اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔

مرزا غالب: خدا حافظ

سین نمبر ۱۵ (اندرون خانہ)

مرزا غالب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں اور خود کلامی کے انداز میں۔

مرزا غالب: ''تم بھی اچھے وقت پر آئے مہاجن جی'' عقب میں بیوی کو دیکھتے ہیں تو ''اوہ بیگم''

امراؤ بیگم: (شاکی نظروں سے) کتنے پیسے جمع ہو گئے مہاجن کے ہاں؟۔۔۔ مجھے بھی تو بنوا دو جوشم نوشم۔۔۔ (بانہیں آگے کرتے ہوئے)

مرزا غالب: (نظر بھر کر دیکھتے ہوئے) ''اِن پھول سے بازوؤں میں بیٹا کھیلے گا تو جوشم (زیور) بھی ہو جائے گا۔

یہ کہہ کر پلٹ جاتے ہیں۔ بیگم پیچھے پیچھے۔

امراؤ بیگم: (تنک کر) ہائے اللہ! بیٹے کا اتنا غم، تو بیٹے جنے نہیں۔۔۔ اب اِس میں میرا کیا قصور، ادھر پیدا ہوئے اُدھر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرزا غالب: (گھورتے ہوئے) بڑی کلا دراز ہو بیگم!

امراؤ بیگم: ''ہاں ہاں میں ہی کلا دراز ہوں، آپ تو چھو میاں ہیں پیارے۔'' اور جھنجھلا کر ''اب آتے ہی کہاں چلے؟''

مرزا غالب: جا رہا ہوں ذرا ذائقہ بدلنے۔۔۔ قلمی آموں کی دعوت ہے مفتی صاحب کے ہاں (اور ٹوپی اُچھالتے خوشدلی سے باہر کی طرف نکل جاتے ہیں)

سین نمبر ۱۶ (مفتی صدر الدین آزردہ کے ہاں کھلے میں آموں کی دعوت کا منظر)

گھنگھور گھٹاؤں کے موسم میں دعوت آم برپا ہے۔ شاعر حضرات مفتی صدر الدین، حکیم مومن خاں مومن، بالم قند حضور، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، جناب محمد علی تشنہ، حکیم آغا جان عیش، فرش پر چوکڑی مارے، دائرے کی شکل میں براجمان ہیں۔ درمیان میں بہت سارے آم ٹوکریوں میں بھی

پڑے ہیں اور ایک پانی بھرے برتن میں بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ شاعر حضرات خوش گپیوں کے ساتھ ساتھ آم بھی چوس رہے ہیں۔ سوائے نواب شیفتہ کے جو حقے کے کش لگا رہے ہیں۔

مرزا غالب: (آم چوستے ہوئے) جس ملک میں آم پیدا ہوتا ہے کیوں نہ اس پر دوسروں کی نگاہیں ہوں' اشارہ فرنگیوں کی طرف تھا' 'کس قدر میٹھا آم ہے۔۔۔'

نواب شیفتہ: (بات قطع کرتے ہوئے) مٹھاس تو گنے میں بھی ہوتی ہے۔

مرزا غالب: (تندی سے) کیا بات کرتے ہو نواب صاحب!

؎ مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نے شکر کیا ہے

یہ شعر کہہ کر مرزا آم چوسنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

''کیا کہنے، واہ واہ، سبحان اللہ۔۔۔ کیا بات ہے۔'' اس شعر پر شعراً خوب داد دیتے ہیں۔

مرزا غالب: نے شکر میں صرف مٹھاس ہوتی ہے، (لیکن) اس مٹھاس میں ہلکی سی ترشی بھی ہے جیسے عورت میں خوبصورتی ہو۔۔۔ تھوڑا نمک بھی۔

صحن کے پار ایک گدھا بندھا کھڑا ہے کس نے آم کے چھلکے اُس کی طرف اُچھالے۔

نواب شیفتہ: ''آم اچھی چیز ہے واللہ'' وہ بغدتے ''مگر اتنا بھی کیا دیکھ لو گدھے بھی نہیں کھاتے''

مرزا نظریں اُٹھا کر گدھے کی طرف دیکھتے ہیں جو اپنی تھوتھنی سے سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ مرزا نہایت اطمینان سے دوبارہ نظریں آموں پر مرکوز کرتے ہوئے ایک چُبتا ہوا فقرہ چست کرتے ہیں۔

مرزا غالب: جو گدھے ہیں وہی نہیں کھاتے۔

اس پر قہقہوں سے محفل گل و گلزار ہو جاتی ہے اور نواب صاحب جز بز ہو کر حقے کی نے ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں۔

مرزا غالب: سُنیے! آم کی صفت میں ایک شعر عرض کرتا ہوں۔

''فرمایئے، ارشاد'' کی آوازیں۔

؎ صاحب شاہ کو برگ و بار ہے آم
ناز پروردہ، بہار ہے آم

بالمقصد حضور: (تنقیدی انداز) آموں کے بارے میں شعر کہا، وہ بھی مشکل۔۔۔ میں پوچھتا ہوں آپ آسان کیوں نہیں کہتے ،شعر سمجھ میں آئے تو داد ملتی ہے۔۔۔نہیں تو فریاد ہوتی ہے۔

مرزا غالب: کون احمق ہے جو سخن نا آشناؤں سے داد چاہتا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

صدرالدین آزردہ: ''بھائی اِن کے بارے میں مجھے میر تقی مرحوم کا قول یاد آتا ہے۔'' سب کی طرف دیکھ کر'' انہوں نے فرمایا تھا، کوئی راہبر استاد مل گیا تو بہت بڑا شاعر بنے گا، ورنہ مہمل میں بکے گا۔''

مرزا غالب: (بُرا سا منہ بناتے ہوئے) اچھے میر مخفل بنے ہو آزردہ صاحب!

اتنے میں سامنے بازار میں ایک فقیر مرزا غالب کی غزل گاتا ہوا آرہا ہے۔

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

دروازے سے باہر کھلے میں دیکھتے ہوئے سب آم چوستے لمحہ بھر کو رُک جاتے ہیں۔

یارب! نہ وہ سمجھے ہیں ، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دِل اُن کو ، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بازار میں آتے جاتے لوگ اس نابینا فقیر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے گزرتے جاتے ہیں جو اس کوچے میں لاٹھی ٹیکتا ہوا لہک لہک کر ترنم سے گا رہا ہے (پلے بیک سنگر محمد رفیع ہیں۔)

تم شہر میں ہو ، تو ہمیں کیا غم ، جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے ، جا کر دل و جاں اور

کیمرہ کٹ کر کے شاعروں پر آتا ہے۔ مرزا خود حیرت زدہ کھڑے ہیں۔

مرزا غالب: (اور خود کلامی کرتے ہوئے)''یا اللہ جس شاعر کو امیر عتیق نے رد کر دیا، اُسے فقیر گاتے پھر رہے ہیں'' اور فقیر کو پکار کر'' حافظ جی!'' اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

مرزا غالب: ''حافظ میاں! یہ غزل آپ نے کہاں سے پائی؟''

حافظ جی: (معصومیت سے) جی میاں دین تو اللہ میاں ہی کی سمجھئے صاحب! پر اپنے پڑوس

میں اِک ڈومنی رہتی ہے۔ مجھ غریب پر ترس کھا کر سکھا دیتی ہے کہ روزی روٹی کما سکوں۔

مرزا غالب: (تجسس سے) کیا نام ہے؟

حافظ جی: جی نام تو موتی بیگم ہے، مگر نہ جانے کچھ دنوں سے وہ اپنے آپ کو چودھویں بیگم کہلوانے پر اصرار کرتی ہے اور جب گاتی ہے تو مرزا ہی کا کلام گاتی ہے۔

مرزا غالب: (چلتے ہوئے) مگر آپ کا کیا خیال ہے مرزا کے بارے میں؟

حافظ جی: ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فقیر یہ شعر گاتا ہوا لاٹھی ٹیکتا چلا جاتا ہے۔ مرزا غالب اُس کی آواز ''اندازِ بیاں اور۔۔۔'' کی سرشاری میں پلٹ کر دوستوں کے پاس آتے ہیں۔

مرزا غالب: خدا حافظ مفتی صاحب! (مرزا اجازت طلب کرتے ہیں)

صدر الدین آزردہ: کہاں چل دیے مرزا؟

مرزا غالب: (مڑ کر دیکھتے ہوئے) ''جہاں میرے اشعار کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر مرزا بیرون راستے پر چل دیتے ہیں۔

صدر الدین آزردہ: عجیب شے ہے یار یہ مرزا بھی۔

سب اس پر قہقہہ لگاتے ہیں۔

سین نمبر ۱۷ (چودھویں بیگم کا بالا خانہ)

سارنگی نواز فدن میاں اپنی مخصوص لہرایا چال میں جھومتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور چودھویں بیگم کو پکارتے ہیں۔

فدن: اماں۔۔۔ارے موتی بیگم!

چودھویں بیگم: ''دُر فٹے منہ'' جھنجھلا کر'' کیا شور مچا رکھا ہے، تنک آرام بھی نہیں کرنے دیتا''

فدن: اچھا تو پڑے رہو۔۔۔کرو آرام، دروازے پر مرزا کھڑے ہیں۔ (کمرے میں موجود ملکہ جان کی طرف دیکھتا ہے)

چودھویں بیگم: (اسپرنگ کی مانند اُچھل کر اُٹھتے ہوئے) کھاؤ میری قسم!

فدن: تیری جان کی قسم بی بی، وہی تو ہیں جو اس دن آئے تھے۔

چودھویں بیگم: ''ہائے اللہ'' اضطراری کیفیت میں ''کیا میلی سی قمیض، چکنی سی شلوار پہن رکھی ہے میں نے'' اور ماں کے پاس جا کر ''اماں جلدی سے کپڑے نکال میرے۔'' پھر لپک کر فدن کو مخاطب کرتی ہے ''مرزا کو کچھ دیر باتوں میں لگائے رکھیو، پھر لائیو اوپر اُنہیں۔''

فدن: اچھا بی بی، اچھا بی بی۔

فدن باہر نکل جاتا ہے۔ چودھویں کی خوشی دیدنی ہے اماں سے خوشامد کے انداز میں ''اماں میرے بال تو بنا دے۔''

ملکہ جان: ''خود ہی بنا لے، میں تمہاری نوکر ہوں۔'' اور سرزنش کرتے ہوئے ''اچھا نہیں اُن کا یہاں آنا۔ جتنے منہ اتنی باتیں بنیں گیں۔'' اور خفگی سے ''ہونہہ'' کہہ کر دوسری جانب چلی جاتی ہے۔

چودھویں بیگم: اور وہ جو اپنی بات بن جائے گی۔

یہ کہہ کر چودھویں جلدی سے کمرے کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔ گاؤ تکیہ درست کرتی ہے۔ کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیتی ہے۔ تخت پوش پر بکھرے کپڑے اُٹھا کر نرم نرم گدے کو درست کرتی ہے۔ کھلے بکسے کو بند کرتی ہے۔ پھر مٹی کے ایک برتن میں کچھ سفوف ڈالتی ہے۔ وہاں سے خوشبودار دھواں نکلتا ہے۔ وہ برتن ہاتھ میں پکڑے، نیک شگون کے طور پر سارے کمرے میں دھونی دیتی ہے۔ اچانک مرزا غالب کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو وہ برتن ایک طرف رکھ دیتی ہے اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے:

چودھویں بیگم: مرزا صاحب آیئے، تشریف لایئے۔

وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مرزا غالب: بن بلائے تو ہم خدا کے گھر بھی نہ جاتے مگر۔۔۔

چودھویں بیگم: اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ وہ آئیں۔

مرزا غالب: (ہنستے ہوئے) یہی سمجھ لیجیے۔ وہ حافظ میاں گاتے ہوئے مل گئے۔ آپ کی غزل میں دعوت کا پیغام پایا۔

چودھویں بیگم: ''بات لڑائی تک رہتی تو الگ تھی'' شرمندگی سے ''میں نے (اُس وقت) آپ کو۔۔۔

مرزا غالب: ''گھر ہی سے نکال دیا'' گویا فقرہ مکمل کر دیا ''اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔۔۔ ہم دونوں کے بیچ میل تھا جو نکل گیا۔ ہم ہی ہم رہ گئے۔

ع ہم اس کے ہیں، ہمارا کیا پوچھنا

چودھویں بیگم: (سہمی ہوئی) ''آپ اتنے بڑے انسان ہیں مرزا صاحب'' یکدم لاج سے گھونگھٹ نکال کر ''میں تو سوچتی تھی، دونوں جہانوں میں بھی نہ بخشی جاؤں گی کبھی'' اور کن انکھیوں سے مرزا کی جانب بھی دیکھتے ہوئے۔ ''وہ سب ہونے پر بھی آپ نے مجھے اِس قابل سمجھا''

مرزا غالب: ''کیسی باتیں کرتی ہو چودھویں بیگم!'' اپنائیت سے قریب آ کر پاس بیٹھ کر ''اپنے آپ کو بیچ سمجھتی ہو!!۔۔۔ مگر تمہارا بھی کیا قصور، تم بھی اُن میں سے ہو جو خود اپنی قیمت نہیں جانتے۔''

چودھویں بیگم: (افسردگی سے) راہ پڑے ہوئے پتھر کی بھی قیمت ہوتی ہے؟

مرزا غالب: ''کیوں نہیں!۔۔۔ نگاہ پڑ جائے تو پتھر بھی ہیرا، نہ پڑے تو ہیرا بھی پتھر'' اور جذباتی لہجے میں ''تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھو، جو مشاعرے کے روز شکست کھایا ہوا، اکتایا ہوا، زندگی سے مایوس۔۔۔ خدا سے شکوہ کرتا آ رہا تھا۔

سے پلادے اوک سے ساقی ، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا ، نہ دے شراب تو دے

۔۔۔ اُس وقت اپنی قدر تمہاری زبانی سنی، یوں معلوم ہوا کھوئی ہوئی منزل مل گئی۔

چودھویں بیگم: ''مرزا صاحب۔۔۔'' جذبات میں رچی بسی اِس آواز میں خوشی، انبساط، احسان مندی اور حیرانی سب آلائشیں تھیں۔

مرزا غالب: ہاں چودھویں! اور آج۔۔۔ آج پھر وہی عالم ہے۔ میں گھر کا ستایا، دوستوں کا ٹھکرایا ہوا یہاں آیا ہوں۔۔۔ کھو گیا ہوں۔ تم ایک بار مجھے میرا پتہ بتا دو۔

چودھویں بیگم: ''مرزا جی، میری جانے کب کی تمنا تھی کہ آپ کا کلام ہو اور آپ ہی کے سامنے گاؤں۔۔۔'' آنکھیں بند کر کے ''ہائے آج تو میں اللہ سے اور بھی کچھ مانگ لیتی۔''

اچانک حشمت خاں کوتوال کمرے میں داخل ہوتا ہے۔۔۔ دونوں کی جانب دیکھتا ہے،

میز پر چھڑی مارتا ہے۔ کوئی توجہ نہیں دیتا۔ وہ دوبارہ چھڑی مارتا ہے مگر دونوں بے خود ہیں۔ اب شیشے پر ضرب لگاتا ہے۔ کانچ ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ چودھویں اور مرزا کی آنکھیں کھلتی ہیں۔

چودھویں بیگم: (ڈھلکے ہوئے لہجے میں) کوتوال صاحب۔

یہ کہہ کر وہ مرزا کے پاس سے اُٹھتی ہے، کوتوال اُس کی طرف آتا ہے۔

حشمت خاں: ہاں موتی بیگم! دیکھو میں کیا لایا ہوں تمہارے لیے۔

وہ ایک زیور والا ڈبہ کھولتا ہے جس میں زیورات ہیں۔ چودھویں بیگم بے اعتنائی ظاہر کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔۔۔ کوتوال کھسیانہ سا ہو جاتا ہے اور خفت مٹاتے ہوئے اب مرزا سے مخاطب ہوتا ہے۔

حشمت خاں: شعروں سے تو بُرے نہیں۔

مرزا غالب: کوئی شعر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی ساری دولت نہیں خرید سکتی۔

حشمت خاں: (قہقہہ لگا کر) یہی ایک اشرفی آپ کا پورا دیوان خرید سکتی ہے۔

مرزا غالب: تو پھر خرید دیکھیے۔

اُس وقت اماں کمرے میں داخل ہوتی ہے اور کوتوال کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتی ہے۔

ملکہ جان: ''ہائے کوتوال صاحب! آپ آگئے'' اور آداب کرتے ہوئے ''آیئے، آیئے۔۔۔''

حشمت خاں: ہاں بڑی اماں، اور آپ کی بیٹی کے لیے نذرانہ بھی لایا ہوں۔

ملکہ جان: زیور ہیں؟'' خوش ہو کر'' کتنے اچھے زیور ہیں میری بٹیا کے'' (ماں زیورات دیکھ کر اُن پر خوشی سے لٹو ہے۔)

حشمت خان اس پر اِترا کر، گھمنڈ سے مرزا کی طرف دیکھتا ہے۔۔۔ مرزا غالب اُٹھ کر چل پڑتے ہیں۔

چودھویں بیگم: ''مرزا جی'' کہہ کر پیچھے لپکتی ہے۔

حشمت خاں: موتی بیگم! (اور اُسے بازو سے پکڑتے ہوئے)

چودھویں بیگم: ''موتی بیگم نہیں'' غصے سے دیکھتی ہوئے ''چودھویں بیگم''

حشمت خاں: ''ذات کی چھوکری۔۔۔'' کرخت لہجے میں ''ابھی سامنے ہی تُو مرزا سے آنکھیں لڑاتی ہے۔'' اور دھکا دے کر گرا دیتا ہے۔ ''میری محبت کا منہ چڑاتی ہے، جانتی نہیں میں کون ہوں۔۔۔ تیرے جیسے کئی رنگیے سدھاروں کے درے کئے ہیں،

کوتوال ہوں، دتی شہر کا۔''

ملکہ جان: ''اے کوتوال صاحب! آپ اس کی باتوں پر نہ جائیے۔'' قریب جا کر ''یہ تو سودائین ہے۔''

چودھویں بیگم: (بپھرے ہوئے) ''ہاں سودائین ہوں۔'' اُٹھ کر جوش سے ''مگر ان کی نہیں''

ملکہ جان: ''گھاس پڑے منہ۔۔۔'' بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے ''تو کوتوال سے اس منہ بھر کا مقابلہ کرتی ہے۔۔۔ شہر کا حاکم تیرا وظیفہ پڑھتا ہے۔ نہ ہی اپنی ذات میں منہ کھول، تیری شادی ہوگی تو ان سے، اور کسی سے نہیں!''

چودھویں بیگم: ''نہیں! میں شادی نہیں کروں گی اماں۔'' چلا کر ''میں لڑکی ہوں کوئی چور مجرم نہیں۔ قانون کے کوڑے پڑتے رہیں جس پر۔'' (یہ کہہ کر تیزی سے دروازے سے نکل جاتی ہے۔)

حشمت خاں: سن لیا بڑی بی۔۔۔ یہی فیصلہ ہے تم لوگوں کا۔

ملکہ جان: ''اے نہیں کوتوال صاحب!'' اُسے بہلانے کے انداز میں ''اس کی عقل کا کیا کروں، نیارنگ لائے گلوری۔۔۔ دماغ میں گرمی ٹھہری کوئی دن میں بھوت اُتر جائے گا مرزا کا۔''

حشمت خاں: ''مرزا کو تو میں سمجھ لوں گا۔'' غصیلے لہجے میں ''تم نکاح کی تاریخ دو۔''

ملکہ جان: جو تم کہو۔

حشمت خاں: جمعہ کا روز ٹھیک رہے گا؟

ملکہ جان: اتنی جلدی، آج تو پیر کا دن ہے۔

حشمت خاں: (بھڑک کر) تمہیں کیا کرنا ہے۔۔۔ روپیہ میرا، بندوبست میرا، اور یاد رکھیو بس جمعے کے روز حشمت خاں دولہا بنا آئے گا۔ چلتی آندھی، جھولتے جھکل سے دلہن کو لے جائے گا۔

سین نمبر ۱۸ (طوائف چودھویں کے کوٹھے پر سگائی کی محفل)

رنگ برنگے، گوٹا کناری سے مزین کپڑوں میں ملبوس خواتین، چودھویں بیگم کی سہیلیاں سج دھج کے ساتھ گھر میں اِدھر اُدھر آجا رہی ہیں۔ ملکہ جان نے زبردستی یہ رشتہ کر دیا ہے۔ بالا خانے پر

خوشی کا سماں ہے۔ نوکرانیاں مشاطہ اور گلریز بھی نئے کپڑوں میں ملبوس چہک رہی ہیں اور فدن میاں جن کے گرد وبہانے بہانے سے چکر لگا رہا ہے۔ ایک طرف کھنکتی چوڑیوں اور کھنکتے قہقہوں کے جھرمٹ میں چودھویں مایوں بیٹھی ہے۔ اُداس وافسردہ۔ ڈھولک بج رہی ہے۔ اُس کی طرف دیکھتی ہوئی ایک لڑکی جھوم کے ٹھلتی ہے گاتی ہوئی۔

منہ پچھلا کے چلی پی کے نگر
موہے کاہے کا ڈر
او مورے بانکے بلم کوتوال۔۔۔

آس پاس بیٹھی دیگر اور لڑکیاں بھی اس ناچ گانے میں شامل ہو جاتی ہیں اور چودھویں سے چھیڑ خانی کر رہی ہیں۔ چودھویں بیگم تنگ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر مسکراتی لڑکیوں بالیوں کی شرارتیں جاری رہتی ہیں۔ رقاصہ لڑکی اُسے لبھاتی ہے، رقص کرتی ہے۔

اپنے پیا اپنے پیا کی میں کوتوالنی
ماری نجریہ دل ہوئے دلی
مہندی سے ہتھیلی ہے لال
او مورے بانکے بلم کوتوال۔۔۔
بن کے دلہنیا میں اِتراؤں گی
اب نہ کسی سے آنکھ ملاؤں گی
دیکھے یہ کس کی مجال
او مورے بانکے بلم کوتوال۔۔۔
گھر میں بلم کے راج کروں گی
ساس نند سے میں نہ ڈروں گی
دیور کو میں دوں گی نکال
او مورے بانکے بلم کوتوال۔۔۔
چلی پی کے نگر موہے کاہے کا ڈر
مورے بانکے بالم کوتوال

گیت کا اختتام ہوتا ہے (شکیل بدایونی کا لکھا یہ گیت ثریا کی آواز میں تھا) چودھویں اُٹھ

کر کمرے میں چلی جاتی ہے اور آنکھ میں آیا آنسو حنائی ہتھیلی سے صاف کرتی ہے۔ میز سے قلم دوات اُٹھاتی ہے۔ قلم کو دوات میں ڈبو کر کاغذ پر کچھ لکھتی ہے۔۔۔(فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۱۹ (چودھویں کا گھر)

چودھویں بیگم سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی ہے اور خادم کو پکارتی ہے۔

چودھویں بیگم: قدن ارے او قدن۔۔۔

صحن میں کھڑا قدن اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔

قدن: کیا ہے بی بی؟

چودھویں بیگم: میرا یہ خط پہنچا دے (اسے خط دیتی ہے)

قدن: جی، جی (وہ چل پڑتا ہے)

چودھویں بیگم: ارے خط لیتے ہی چل دیا، پوچھا بھی نہیں کس کے نام ہے، کسے پہنچانا ہے۔

قدن: ''جی، مرزا کو اور کسے'' شرارت سے آنکھیں نچا کر ''تم قدن کو کیا سمجھتی ہو بی بی، ہمیں سب پتہ ہے بھلے افیون چکھتے ہیں، ساتویں آسمان کی خبر رکھتے ہیں۔''

چودھویں بیگم ایک ٹک اسے دیکھتی، شرمائی سی اندر کی جانب چل دیتی ہے۔

سین نمبر ۲۰ (دِلّی کے ایک بازار کا منظر)

جمنا سے آتے خوشگوار ہوا کے جھونکوں میں دِلّی کے بازاروں میں رونق دنیا رواں دواں ہے۔ قدن میں بھی بیچ بازار اپنی مخصوص لہریا چال چلتے ہوئے جا رہے ہیں۔ فقیر سورداس چوکھٹ کے پاس بیٹھا ہے۔ وہاں سے گزرتا ایک آدمی اُسے پیسے دیتا ہے۔ بازار سودا سلف سے اَٹے پڑے ہیں۔ سامان سر پر اُٹھائے لوگوں کے انبوہ میں سے گزرتے ہوئے، مزدور پیشہ افراد، جانب منزل رواں ہیں۔ چھابڑی فروش آوازیں لگا رہے ہیں۔ خواتین خال خال، مرد حضرات زیادہ تر خریداری میں مشغول ہیں۔ (اصل میں مغل فرمارواؤں کو خواتین کی آسائش منظور تھی۔ فرمان جاری تھا کہ روزمرہ کا سودا سلف گلی گلی اور کوچے کوچے میں پھیری والے آواز لگا کر فروخت کریں۔ چنانچہ دِلّی میں یہ دستور چلا آ رہا تھا۔ اِس طرح بادشاہوں کی دولت میں سے حصہ رسد سب کو پہنچتا تھا۔ قصائی، کیسرے، کنجڑے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منہیار، فصل کا میوہ، رُت کا پھل بیچنے والے دلکش آوازیں لگا کر گلی گلی بھی سودا بیچتے پھرتے تھے۔ اِس طرح گھر کی عورتیں ضرورت کی چیزیں یہاں تک کہ بیٹی کا

پورا جہیز گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر جمع کر لیتی تھیں۔ تاہم) بازاری آوازوں کی بھنبھناہٹ میں سے گزرتے، فدن میاں بیچ راہ میں کھڑے افراد میں سے بچتے بچاتے، راستہ بناتے نکلتے جا رہے ہیں۔
ایک موڑ پر فٹ پاتھ پر دو آدمی موٹی پان فروش عورت چھبیلی کے پاس بیٹھے پان چبا رہے ہوتے ہیں۔
فدن میاں جیسے ہی موڑ مڑے، چھبیلی کی آواز آتی ہے۔

پان فروش چھبیلی: فدن میاں، اوہ فدن میاں! کہاں جا رہے ہو۔ آج پان نہیں اُڑا رہے؟ مگر فدن میاں جاتے جاتے ہاتھ کے اشارے سے "نہیں" کرتا ہے۔

فدن: "آج اپن بہت ضروری کام سے۔۔" عادتاً پلٹ کر دیکھتا ہے اور آنکھیں جھپکتا ہے "اللہ کی قسم، آپ تو بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔۔۔ گوری گوری بیاں میں، پیاری پیاری چوڑیاں۔ دل لوٹ پوٹ۔۔۔" پان لگاتی کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور منہ میں رکھی گلوری میں دبی مسکراہٹ دیکھ کر دُور سے آواز لگاتا ہے۔ "تم گلوری بنا کر رکھو ہم ابھی آتے ہیں۔"

چھبیلی: ہائے لیتے جاؤ گے ہاتھ، اتنا بھی کیا ہے۔

فدن: ارے تم نہیں جانتی چھبیلی! آج چاہے مجھے کوئی روک کے، آج کام ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے۔

چھبیلی: اچھا!! (حیرت سے)

فدن: آج کوئی جن، کوئی پری ہمیں نہیں روک سکتی۔

یہ کہہ کر فدن آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک موڑ کاٹتا ہے۔ ایک دکان کے سامنے ایک آدمی پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ تھڑے پر ایک نشئی اونگھ رہا ہے۔ ایک عمر رسیدہ شخص بھی بیٹھا ہے۔ فدن کی پارہ آنکھیں تھرکتی ہوئی اُدھر دیکھتی ہیں تو بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے۔

فدن: فٹے منہ، شیطان کا گھر آ گیا۔

برآمدے کے پیچھے دروازے سے ٹیپو نکلا آ رہا ہے۔ یہ چنڈو خانہ ہے جس کے اوپر بورڈ پر لکھا ہے۔

ٹھیکہ مسکرات
ٹھیکیدار: منشی زاہد خاں

فدن پر نظر پڑتے ہی ٹیپو آواز لگاتا ہے۔

ٹیپو: ہاں فدن میاں! ۔۔۔ کہاں رہے، گھوٹ کردارو پی ہو رہا ہے۔
فدن: دارو کا نام مت لو، مجھے نفرت ہے۔ پینے والے کو دیکھیں تو لاحول ولا تو پڑھیں۔
ٹیپو پاس آکر پیار سے اُس کی داڑھی کو پکڑتے ہوئے۔
ٹیپو: ارے تم پیو نہ پیو، چلم کا ایک کش تو لگا لو ہماری قسم!
فدن: ''دھت تیرے کی، قسم ڈالی ہے۔'' بے بسی سے ''اب تو ایک کش لگانا ہی پڑے گا۔۔۔ صرف ایک کش، زیادہ کھو گے تو چلا جاؤں گا۔''
ٹیپو: توبہ توبہ۔۔۔ ارے چلو نہ صاحب
فدن: (بادل نخواستہ اندر جاتے ہوئے) ارے بڑے ضروری کام سے جا رہے ہیں۔
چنڈو خانے کے اندر دھویں کے بادل تیر رہے ہیں۔ بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں ہیں۔ بھنگ گھوٹی جا رہی ہے۔ چند نشئی افراد سرشار پڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خورشید میاں نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے۔ ''گجے رگڑا، مٹے جھگڑا''
خورشید میاں پاس آجاتے ہیں۔
خورشید میاں: آؤ فدن میاں۔۔۔ اوہ ٹیپو میاں تم بھی آگئے۔
ٹیپو: ہاں جی، آگئے۔
بھنگیوں کی ٹولی، سب نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ (فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۲۱ (شادی والا گھر)

زرق برق لباسوں میں ملبوس خواتین، چودھویں بیگم کے ہاں شادی کی گہما گہمی، ڈھولک بج رہی ہے۔ سہیلیاں گا رہی ہیں۔

بابل ہاری رچی تیری شادی
پریتم پیاری رکھی تیری شادی

ایک سہیلی لڑکیوں میں سے اُٹھ کر چودھویں کے پاس آتی ہے اور پوچھتی ہے۔
نازو: آیا نہیں؟
چودھویں بیگم: ''نہیں نازو! منگل کی صبح بھیجا تھا۔ آج جمعرات ہے۔'' فکر مندی سے ''نہ جانے فدن کہاں اور کس جگہ دفن ہو گیا۔''

یہاں کیمرہ دوسرا سین دکھاتا ہے۔

سین نمبر ۲۲ (چنڈوخانہ)

قدن دیگر نشئی افراد کے ساتھ نشے میں دھت لیٹا ہے۔ ٹیپو اُسے ہلاتا ہے۔

ٹیپو: اے قدن میاں! اسلام علیکم

قدن: (آنکھیں کھولتے ہوئے) وعلیکم السلام

ٹیپو: ارے تمہارا خط گرا پڑا ہے بھائی۔۔۔ ارے خط گرا پڑا ہے تمہارا۔" ٹیپو خط اُٹھا کر اسے دیتا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھتا ہے۔

قدن: (اسے یاد آ گیا) ہاں اِسے تو میں نے پہنچانا تھا۔ لعنت ہے سارا دن ضائع کردیا۔۔ مگر ابھی بھی کچھ دیر نہیں ہوئی۔

خورشید میاں: کیسی دیر، ارے کہاں کی دیر۔۔۔ ایک کش اور لگا لو۔۔۔

قدن: "نہیں بھیا۔۔۔ لو میں چلا۔ آج منگل، اگلے منگل کو ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ" چنڈوخانے سے باہر نکل کر "یااللہ"۔۔۔ بازار میں فقیر آواز لگاتا ہے۔

"خوش رہے تیری نگری جمعرات ہے۔"

قدن: "جمعرات؟" (حیرانی سے)

فقیر: بھلا ہو بھلا۔

بازار کی رونق اُسی طرح آباد ہے۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ دکانوں پر خریداروں کا ہجوم، ایک شخص پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ راہ گیروں میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا نابینا فقیر پھر دہراتا ہے۔

فقیر: سخی بابا سن لے ہماری بھی صدا، خدا تجھ کو دنیا کی دے رونقیں۔

ایک چھوٹی بچی فقیر کے کاسے میں سکہ ڈالتی ہے۔ ایک راہ گیر بھی پیسے دیتا ہے۔

فقیر: جمعرات ہے۔۔۔

قدن: "اماں ہے جمعرات کیوں؟۔۔۔ جمعرات کیسی؟؟" اور اُچھل کر فقیر سے کہتا ہے "جب بھی چاہا جمعرات منا دی۔"

فقیر: میاں جی جمعرات ہے۔

قدن: (جھنجھلا کر) پھر وہی بات!

اتنے میں پیچھے سے ٹیپو بھی وہاں آ جاتا ہے۔

ٹیپو: کیا بات ہے فدن میاں!۔۔۔کوئی جھگڑا اوگڑا ہے کیا؟

فدن: کوئی بات نہیں ٹیپو میاں۔۔۔آپ فرماتے ہیں آج جمعرات ہے۔

ٹیپو: بھئی پاگل ہوگیا ہے۔'' ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے'' آج تو منگل ہے۔''

فدن: ''ہونہہ''

ٹیپو: ''ماگومیاں!'' فقیر سے مخاطب ہو کر'' منگل ہے آج''

فدن: ہاں بالکل منگل سولہ آنے منگل

فقیر: (ان کی حالت پر فکر مند ہو کر) اللہ رحم کرے۔

کیمرہ اوپر ایک چبوترے کو فوکس کرتا ہے جہاں نقارہ پیٹا جا رہا ہے اور ایک شاہی مناد آواز لگا رہا ہے۔

''خلقت خدا کی، حکم بادشاہ کا۔۔۔کل جمعہ کے روز میرٹھ شہر میں میلہ ہوگا جو سوداگر اپنا مال لائے گا اُسے محصول چونگی معاف۔''

اعلان کے بعد کیمرہ فدن اور ٹیپو پر آتا ہے۔

فدن: ''کل جمعہ، آج جمعرات۔'' سوچتے ہوئے'' بیچ میں سے یہ بدھ کہاں چلا گیا؟''

ٹیپو: اماں! یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔

فدن: (یاد کرتے ہوئے) ہاں! اب سمجھا، اماں اُس دن منگل تھا، (نشے میں) پڑے رہے تو بدھ ہوگیا۔

ٹیپو: (برجستگی سے) ہوگیا۔

فدن: جاگے تو جمعرات تھی۔

سربازار کھڑا فقیر صدا لگاتا ہے۔'' جمعرات ہے راہ مولا کچھ مل جائے بابا!''

فدن: ''لو بابا'' جلدی سے جیب سے نکال سکہ دیتا ہے'' تم جیتے ہم ہارے۔''

سین نمبر ۲۳ (مرزا کا گھر گلی قاسم جان)

فدن مرزا غالب کے دوارے باہر نیم دراز پڑا ہے۔ ملازم کلو باہر نکلتا ہے تو اُس پر نظر پڑتی ہے پاس آتا ہے۔

کلو: اُٹھیے۔۔۔کون ہو تم؟

قدن: (نقاہت سے کپڑے جھاڑ کر اُٹھتے ہوئے) جی میں قدن ہوں حضور۔

مرزا غالب بھی آ جاتے ہیں اور اُسے دیکھ رہے ہیں۔

قدن: ''آج کیا دن ہے؟'' تخاطب کلّو تھا۔

کلو: جمعہ ہے۔

قدن: ''ج ج جمعہ، آہاں۔۔۔'' اپنے کو کوستے ہوئے ''جمعہ لعنت ہے۔''

مرزا غالب پر نظر پڑتی ہے سہمے ہوئے انداز میں۔

قدن: ''شکر ہے اللہ کا'' جیب سے خط نکال کر ''یہ خط میں آپ کے لیے لایا ہوں سرکار۔۔۔میں نے کہا دیر نہ ہو جائے، اس لیے سویرے سویرے ہی چلا آیا۔''

مرزا اُسے کھولتے ہیں۔نظریں خط پر ٹکی ہیں۔یہاں پس منظر میں چودھویں بیگم کی آواز اُبھرتی ہے۔

مرزا جی!

ہزار سلام

نہ جانے یہ خط میں آپ کو کیوں لکھ رہی ہوں۔جانتی ہوں آپ پر میرا کوئی دعویٰ نہیں، کوئی حق نہیں، میرا جب بھی میرا دل۔۔۔آواز دیتا ہے۔میں اپنا دکھڑا آپ کے سامنے روؤں، میری ماں دو ہزار ٹکوں کے بدلے۔۔۔میری ماں مجھے قصاب کے ہاتھ بیچ رہی ہے۔۔۔

(اتنا پڑھ کر مرزا غمزدہ سے بیٹھ جاتے ہیں)

اور میں بکنا نہیں چاہتی۔میں جانتی ہوں آپ شاعر ہیں، زمانے کا درد ہے آپ کے دل میں۔کیا آپ میرا اور دنہ بتائیں گے؟۔۔۔میرے تک نہ آ سکیں گے، اس وقت جبکہ ہر چھوٹا بڑا مجھے نصیحتوں سے چھلنی کیے دے رہا ہے، مجھے آپ ہی کے شعر کا سہارا ہے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

آپ کی چودھویں

غالب خط پڑھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں۔

قدن: وہاں کیا عرض کروں حضور؟

مرزاغالب: خط ملا، احوال سے آگاہی ہوئی (مختصر جواب)

خط جیب میں ڈالتے ہوئے مرزا اندر کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ صندوق کھولتے ہیں۔ اُس میں ایک تھیلی سی نکالتے ہیں۔ (فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۲۴ (صادق میاں کا جوا خانہ)

مرزا غالب زیرِ زمین جوئے خانے کی سیڑھیاں اُترتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں جواری بیٹھے ہیں اور کوڑی پانسہ چل رہا تھا۔

نوشاد علی: (استقبالیہ انداز میں) آہا مرزا صاحب، آیئے۔

نواب شیفتہ: (خوش ہوکر) خوش آمدید!

نوشاد علی: ''تم تو عید کا چاند ہی ہوگئے۔'' اظہارِ الفت کرتے ہوئے ''واللہ، ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

مرزا غالب: ''کیا بتائیں بھائی!'' (تاسف سے)

ع ہم سے چھوٹا ہے قمار خانۂ عشق
وہاں جو جائیں گرہ میں مال کہاں؟

نوشاد علی: ''مال کی آپ کو فکر کہاں۔ بس ایک اور (ملکہ برطانیہ کے نام) قصیدہ لکھ دیجیے۔'' طنزیہ انداز میں ''بس مال ہی مال ہوجائے گا۔''

مرزا غالب: ''بھائی مال کا بندوبست ہے۔'' چھکتے ہوئے تھیلی اُچھال کر ''دیکھیے کیا ہوتا ہے۔''

مرزا اچھی کوڑیاں کھیلتے تھے۔ چوسر بچھی تھی۔ نواب شیفتہ ایک طرف ہوجاتے ہیں۔

مرزا غالب: ارے پاؤبارہ۔۔۔ (پانسے پر گوٹیاں پھینکتے ہوئے)

نوشاد علی: (اپنی باری پر) ارے کس طالع من نام سے کھیلتے ہو؟

مرزا غالب: ''طالع من نہیں بھائی!'' گوٹیاں اکٹھی کر کے پھینکتے ہوئے ''بھی حاجتمند''

(فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۲۵ (چودھویں بیگم کا گھر)

فدن میاں گھبرائے سے گھر میں داخل ہوتے ہیں، مشاطہ اور نگر یز چودھویں کی نوکرانیاں گھریلو کاموں میں لگی ہیں۔ چودھویں بیگم کی نظر جب اُس پر پڑتی ہے۔

چودھویں بیگم: ''کہاں مر گئے تھے؟'' پاس آکر ''کہاں تھے اب تک، بتاؤ خط دیا میرا۔''
قدن: ہاں (داڑھی کھجاتے ہوئے)
چودھویں بیگم: کہو کیا جواب ملا؟
قدن: ارے جواب ہی تو دے دیا بی بی۔۔۔کہنے لگے خط ملا، احوال سے آگاہی ہوئی۔
چودھویں بیگم: (استفہامیہ) بس اور کچھ نہیں کہا؟
قدن: نہیں بی بی!
چودھویں بیگم کے چہرے پر یاسیت کے تاثرات اُبھر آتے ہیں۔
چودھویں بیگم: نہیں، میری غزلوں کے بادشاہ ایسے تو نہ تھے۔
کیمرہ کٹ کر کے پھر دوسری جانب جاتا ہے۔

سین نمبر ۲۶ (جوا خانہ)

مرزا غالب: یہ کیا؟
نواب شیفتہ: ایسے جیتتے نہیں دیکھا کسی کو۔
مرزا غالب: (نواب کی طرف دیکھ کر) تم بھی جہاندیدہ کھلاڑی ہو۔۔۔
نوشاد علی: میرے خدا کی قسم۔
مرزا غالب: ''چلو اجازت میاں!'' اُٹھتے ہوئے ''مجھے ایک ضروری کام ہے۔''
نوشاد علی: اچھا تو ایک شرط ہے۔۔۔ایک بازی اُدھار رہی ہماری۔
مرزا غالب: (مسکرا کر) یہ بات منظور۔
نوشاد علی: اچھا تو پھر خدا حافظ۔
مرزا غالب: (گوٹی اچھال کر) خدا حافظ۔

سین نمبر ۲۷ (بارات کا منظر)

چودھویں بیگم کے کوچے میں حشمت خاں کی بارات آ رہی ہے۔ کوتوال حشمت خاں سہرا باندھے گھوڑی پر بیٹھا ہے۔ ارد گرد باراتیوں کا ہجوم ہے۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ حشمت خاں چہرے پر سے سہرے کی لڑیاں ایک ہاتھ سے ہٹائے شاداں فرحاں من کی ملکہ چودھویں بیگم کو بیاہنے آ رہا ہے۔

سین نمبر ۲۸ (بالا خانہ، جہاں شادی کی تقریب برپا ہے)

نازو: سنا ہے بارات وہاں چل پڑی ہے بی اماں!

ملکہ جان: ''ارے کس سے سنا؟'' اِس ہنگامے میں نوکرانی کو کوستی ہوئی ''یہ کمبخت ماری کہاں مرگئی۔'' اور کمرے میں چودھویں بیگم دلہن بنی بیٹھی ہے۔

چودھویں بیگم: ''بس ختم ہوگئی کہانی۔'' خود کلامی کرتے ہوئے ''ہائے کتنی لمبی کہانی سوچی تھی۔۔۔۔ سننے والے جاگتے رہیں گے، ہمیں ہی کہتے کہتے سو جاؤں گی۔''

اور مایوسی و پریشانی میں اُٹھ کر ٹہلتی ہے۔

سین نمبر ۲۹ (باہر صحن میں شادی کا ہنگامہ)

بنی ٹھنی خواتین میں سے راستہ بناتی موٹی پان فروش چھبیلی چلی آرہی ہے۔ مٹھائی اُٹھائے ہوئے اور فدن کو ہاتھ مار کر اُٹھاتی ہے جو آج بھی نشے کی ترنگ میں اونگھ رہا ہے۔

چھبیلی: ارے او دہ میاں! (اور اُسے لڈو دکھا کر خود منہ میں ڈال لیتی ہے)

فدن: ''ارے مرد کہیں، جا کے خصم کر و بھینس کی نانی!'' بیزاری سے ''ساری نیند ہلاکر رکھ دی۔ سارا نشہ ہرن کر دیا۔''

چھبیلی: (طنزیہ) افیون کی ڈبیہ!

فدن: ''لاحول ولاقوت'' چونکتے ہوئے ''کہاں گئی میری افیون کی ڈبیہ۔۔۔۔ میری دلبر، میری دلدار۔۔۔''

چھبیلی: یہ رہی! (اشارہ مٹھائی کی طرف)

فدن: (چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر) ارے مرد کہیں جا کے

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر گمشدہ ڈبیہ کی جستجو کرتا ہے اور چھبیلی اس خوشی کے موقع پر اُس کا مزہ لیتے ہوئے ہنستی جاتی ہے۔

سین نمبر ۳۰ (چودھویں بیگم کا کمرہ)

دلہن بنی چودھویں بیگم کچھ تلاش کر رہی ہے۔ پلنگ کی چادر تلے سے کچھ ملتا ہے۔ کیمرہ مُوو کر کے سیڑھیاں طے کرتے کرتے فدن کو دکھا رہا ہے۔ کیمرہ پھر چودھویں بیگم کو فوکس کر رہا ہے جو پلنگ کی چادر کے نیچے سے ملنے والی کوئی چیز کھانے لگتی ہے۔ ٹھیک اُسی وقت نوکر فدن کسی کام سے کمرے میں

داخل ہوتا ہے اور اس عمل پر لپکتے ہوئے چودھویں بیگم کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ جس میں اُس کی افیون سے بھری ڈبیہ ہے۔

قدن: ''بی بی یہ کیا دیوانگی ہے۔'' افیون چودھویں بیگم نے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر لی ہے۔ ''لاؤ، دے واپس کر میری ڈبیہ۔''

چودھویں بیگم: نہیں نہیں۔

قدن: ''بڑی بی بی'' چلا کر آواز دیتا ہے ''آنا بڑی بی بی۔۔۔ دوڑی آؤ''

چودھویں بیگم: ''تجھے بچپن کی قسم'' واسطہ دے کر ''تجھے میری قسم، مجھے مرنے دے۔۔۔ چھوڑ دو چھوڑ دو''

قدن: (پھر زور سے چلاتا ہے) اماں، پاگل ہوگئی ہے بی بی۔

چودھویں بیگم: (زور لگاتے ہوئے) ہاں پاگل ہو گئی ہوں، اس قصاب کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔ بڑی اماں تیزی سے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

ملکہ جان: ''کیا ہوا؟'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے ''کیوں چلا رہا ہے؟؟''

قدن: سنبھالو اپنی دلہن کو! افیم کا اڈہ کھانے چلی تھی۔

ملکہ جان: ''نہیں'' بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ ''ہائے میں مرگئی، میری بچی یہ کیا کرنے لگی تھی۔۔۔'' اور کوستے ہوئے ''مجھے کیا پتہ تھا تُو اتنا بڑا۔۔۔''

چودھویں بیگم: (روہانسی ہو کر) مجھے جانے دو اماں، میں جینا نہیں چاہتی۔

ملکہ جان: ''میری غلطی معاف کر دے بیٹا، کچھ بھی ہو پھر بھی ماں ہوں تیری، دیکھ میرے سفید بال لیکن۔۔۔ دفعہ پڑے کوتوال، بھاڑ میں جائے اُس کا مال اور زیور۔۔۔'' اور پاس کھڑے قدن سے مخاطب ہو کر ''قدن میاں تم باہر جاؤ اور (یہ سب) روکو''

سین نمبر ۳۱ (چودھویں بیگم کا سجا سجایا گھر آنگن)

بڑی اماں ملکہ جان بیٹی کو سمجھا بجھا کر نیچے صحن میں آتی ہے۔ اُدھر مرزا غالب دروازے میں وارد ہو رہے ہیں۔

ملکہ جان: ہائے مرزا جی!۔۔۔ تم آ گئے مرزا جی، تم کتنے اچھے ہو۔

مرزا غالب: تم بھی کتنی اچھی ہو بڑی اماں! جو بیچ رہی ہو اپنی دلاری کو، دُکھ کی ماری کو۔۔۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنی دلاری کو اُس قصاب کے پلّے باندھ رہی ہو۔

ملکہ جان: نہیں (ندامت سے)

مرزا غالب: ''جھوٹ کیوں بولتی ہو، یہ خط کس بات کی فریاد تھی؟'' باہر کی طرف اشارہ کر کے ''وہ بارات کس چیز کی منادی ہے؟''

ملکہ جان: میری غریبی میرے افلاس کی (منادی)۔۔۔ مَیں نگوڑی مصیبت کی ماری، اپنی بیٹی کو بیچ کر قرض چکانے چلی تھی۔ ہائے یہ پیسہ ہی فتنے فساد کی جڑ ہے ساری۔''

مرزا غالب: ''یہ رہا پیسہ'' روپیوں کی تھیلی بڑی اماں کو پکڑا کر ''کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ دے کہ پیسہ نہ تھا۔ اِک معصوم کی معصومیت بِک گئی، ایک مومن کا ایمان چلا گیا''

ملکہ جان: ''آپ جیسا کوئی نہیں اس دنیا میں'' تشکر سے ''مَیں تو پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی، اب آپ ہی جایئے اور خوشخبری سنا دیجیے'' اشارہ اوپر چودھویں کے کمرے کی طرف ''میری تو ہمت نہیں پڑتی''

اور مرزا غالب اوپر سیڑھیوں کی جانب چل دیتے ہیں۔

سین نمبر ۳۲ (بازار میں سے بارات گزرنے کا منظر)

بارات چودھویں کے گھر کی طرف آ رہی ہے۔ آگے آگے بینڈ باجے والے ہیں۔

سین نمبر ۳۳ (اب بارات دروازے پر)

مرزا اوپر آتے ہیں۔ لڑکیاں، بالیاں دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اُتر رہی ہیں۔

''دولہا آ گیا، دولہا آ گیا''

کمرے میں چودھویں بیگم بارات کی آمد کے شور پر کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

مرزا غالب: (کمرے میں داخل ہو کر) مَیں آ گیا۔

چودھویں بیگم: (اُسی کیفیت میں) ''چلے جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے مَیں کہتی ہوں، میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تم بھی آ گئے ایک مجبور لڑکی دیکھ کر، تم شادی۔۔۔'' اِسے

حشمت خاں سمجھتے ہوئے شدتِ غم سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔'' چلے جاؤ۔ میں نے جس کا ہونا تھا ہو چکی۔۔۔نکل جاؤ نکل جاؤ میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔''

سین نمبر ۳۴

مرزا واپس جا رہے ہیں۔ صحن میں کھڑی بڑی اماں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔

ملکہ جان: ''کیا ہوا؟'' انداز خود کلامی کا ''اِس نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔''

سین نمبر ۳۵

مرزا غالب کی پالکی نکل رہی ہے اور بارات اندر داخل ہو رہی ہے۔ عین ٹاکرے پر مرزا کے مقابل گزرتے ہوئے حشمت خاں سہرا اُٹھا کر فاتحانہ دیکھتا ہے۔

سین نمبر ۳۶ (چودھویں بیگم کا گھر)

ملکہ جان: ''کیا ہوا موتی!'' کمرے میں داخل ہو کر ''مرزا جی کیوں گئے ہیں؟ اور مرزا کو تو تمہارے پاس بھیجا تھا۔''

چودھویں بیگم: (حیرانی سے آنکھیں پوری کھول کر) ہائے اللہ، کیا وہ مرزا تھے؟ اور بیخود ہو کر باہر کی طرف بھاگتی ہے۔ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہے۔ ''مرزا، مرزا'' پکارتی ہے۔ دروازے پر حشمت خاں اُس کا دولہا کھڑا ہے۔

حشمت خاں: ''سر بازار مرزا، مرزا چلّانے سے مطلب؟'' اور اُسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے ''چل اندر۔۔۔''

چودھویں بیگم: ''چھوڑیئے مجھے، چھوڑیئے مجھے۔''

ماں بھی بھاگتی ہوئی پیچھے ہے۔

چودھویں بیگم: (غصے سے) چھوڑیئے۔

حشمت خاں: ''نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔'' اور سبکی محسوس کرتے ہوئے اُس کو سیڑھیوں کے اوپر کمرے میں لے جا کر پھینکتا ہے۔ اس کے پیچھے ہی ماں بھی کمرے میں آتی ہے۔

حشمت خاں: (بڑی اماں سے مخاطب ہو کر) جانتی بھی ہے کیا کہہ رہی ہے بڑھیا!

ملکہ جان توجہ نہ دیتے ہوئے کمرے میں پڑا اُس کا سامان اور زیورات وغیرہ اُٹھا کر اُس کی طرف پھینکتی ہے۔ حشمت خاں تیور بھانپ جاتا ہے۔

حشمت خاں: ''کیا کر رہی ہو۔ بڑی اماں، گھر بلا کر میری یہ بے عزتی۔۔۔'' اور غصیلے لہجے میں

"میں نے تیرے جیسے کئیوں کے نشے ٹھیک کروائے ہیں۔ میں کوتوال ہوں!"

ملکہ جان: (سرد لہجے میں) کوتوالی کو اپنے پاس رکھ، کوتوال سے بڑا بادشاہ اور بادشاہ سے بڑا خدا۔

حشمت خاں: ایسی بھول میں مت رہیو کہ میں یوں سرِ بازار اپنی پگڑی اتروا کر چلا جاؤں گا۔

ملکہ جان: (آگ بگولہ ہوتے ہوئے جھک کر) تو کیا تیرا باپ بھی جائے گا۔

حشمت خاں: "پروردگار کی قسم! تیری۔۔۔ تیری اس بیٹی کی اور اُس مرزا کی، پگڑی اُتروا کر نہ رکھ دوں تو حشمت خاں نام نہیں میرا۔۔۔ یاد رکھنا!" (یہ کہہ کر باہر نکل جاتا ہے)

ملکہ جان: "کرلے جو کرنا ہے" (اور ہاتھ میں پکڑا جوتا اُس کے پیچھے پھینکتی ہے)

چودھویں بیگم: امّاں (کہہ کر ماں سے لپٹ جاتی ہے)

سین نمبر ۳۷

غالب اپنے گھر کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مرزا کی بیگم نماز پڑھ کر سلام پھیرتی ہیں۔ آس پاس صحن میں کلو بھی منڈلا رہا ہے۔ مرزا غزل سراہوتے ہیں (پلے بیک سنگر طلعت محمود کی پرسوز آواز ہے)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۔۔۔ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ۔۔۔ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال ۔۔۔ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! ۔۔۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ! ۔۔۔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

سین نمبر ۳۸ (مرزا کی نئی رہائش گاہ کالے شاہ صاحب کی حویلی)

متھراداس مہاجن مرزا سے قرض کا تقاضہ کر رہا ہے۔

متھراداس: (بے دیدے انداز میں) اب دیجیے تو دیجیے ورنہ میں کالے شاہ کے پاس جاتا ہوں۔

مرزا غالب: (گھبرا کر) ارے میاں ٹھہرو!

؎ پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

(شعر پڑھ کر) میں حقیر بے چارہ، فقیر آدمی، میرے پاس تو چند شعر ہیں:

؎ چند تصویرِ بتاں ، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

امراؤ بیگم عقب میں چلمن سے دیکھ رہی ہیں، چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔

مرزا غالب: (قلم ہاتھ میں ہے، مسؤدہ اُٹھا کر دیتے ہیں) یہی لے جاؤ بھائی۔

متھراداس: ''ہوہوہو'' مزاحیہ ہنسی میں ''مرزا صاحب آپ بھی مذاق کرتے ہیں، بھلا بازار میں اِن شعروں کا کیا مول؟''

مرزا غالب: ''ٹھیک کہتے ہو متھراداس! پیسے کی دنیا میں شعر کا کیا مول؟۔۔۔'' چہرہ مزید سنجیدہ ہو جاتا ہے۔'' جب بھی تم انہیں رام پور دربار میں لے جاؤ، دو چار سو روپے جو مل جائیں وہ غنیمت ہیں۔''

امراؤ بیگم: ''یہ شعر بکاؤ نہیں مہاجن جی!'' تند لہجے میں ''ابھی یہ منہیار (چوڑیاں) لے جایئے'' کلائیوں سے اُتار کر، پردے میں سے باز وآگے کرتے ہوئے۔'' جب اللہ ہمیں دے گا تو آپ کو بھی دے گا۔''

مرزا غالب: ''نہیں نہیں۔'' صدمے سے بیٹھتے ہوئے ''نہیں بیگم، مجھے ایسی موت نہ مارو۔۔۔'' متھراداس مہاجن پیچھے ہوئے، بہی کھاتہ بغل میں دبائے، چھڑی ٹیکتے ہوئے چلمن کی اور چند قدم بڑھتا ہے۔

متھراداس: نہیں نہیں بھابھی میں سود خور ضرور ہوں لیکن اتنا کٹھور نہیں۔۔۔ بس اپنے قرض کی یاد دلانے آیا تھا۔ جب کچھ (انتظام) ہو جائے تو اطلاع دیجیے''

امراؤ بیگم سے تخاطب کے بعد، جو پردے میں کھڑی ہیں متھراداس مہاجن چھڑی ٹیکتا مرزا کے پاس آتا ہے، مرزا غالب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

متھراداس: (کمال مہربانی سے) اگر سو دو سو کی ضرورت ہو تو منگوا لیجیے۔

مرزا غالب: (تشکر سے، مہاجن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

متھراداس: نہیں نہیں، شکریے کی کوئی بات نہیں، اجازت دیجیے (ہاتھ جوڑ کر جھکتے ہوئے آداب عرض کرتا ہے)

مرزا غالب: ''آداب عرض'' (جواب دیتے ہیں)

متھراداس: (رخصت ہوتے ہوئے) بیگم صاحبہ سے کہیے کہ ان پیسوں کے لیے کسی دلہ میں نہ پڑیں۔

سین نمبر ۳۹ (بازار کی چہل پہل)

مہاجن مرزا کے ہاں سے نکلتا ہے اور چھتری ہاتھ میں پکڑے، بہی کھاتہ بغل میں دبائے اپنی مخصوص جھومتی جھامتی چال چلتا جا رہا ہے۔ مشکوک بٹتا اور کچھ مزاحیہ سی بھی۔ بازار کی چہل پہل میں سے گزرتا ہے تو پیچھے سے دو سپاہی آ رہے ہیں۔ ایک موڑ پر مہاجن بلا ارادے پیچھے مڑکر دیکھتا ہے اور تیز ہو جاتا ہے۔ سپاہی بھی تیزی سے اُس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ ارد گرد آتے جاتے لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔ بھانت بھانت کی آوازیں، مہاجن چلتے چلتے کن اکھیوں سے سپاہیوں کو دیکھتا بھی جاتا ہے اور فکر مندی سے اِس آفت پر منہ میں کچھ بڑبڑاتا بھی جاتا ہے۔ ''تیل مالش۔۔۔'' تلاش روزگار میں ایک مالشی کی صدا آتی ہے۔ ایک پالکی اُس کے قریب سے گزرتی ہے اور سپاہی قریب آکر مہاجن کو روک لیتے ہیں۔

سپاہی: آپ ہی ہیں نا متھراداس مہاجن! ٹھہریئے ٹھہریئے۔

متھراداس مہاجن سپاہیوں کے نرغے میں حواس باختہ سا کھڑا ہے۔ آتے جاتے لوگ دیکھ رہے ہیں۔

متھراداس: (پریشان سا) میں نام ہی بھول گیا اپنا۔

سپاہی تیکھی نظر سے دیکھتا ہے۔

متھراداس: ''جی، جی نہیں'' گھبرا کر آگے بڑھنا چاہتا ہے دوسرا سپاہی اُسے قابو کرتا ہے ''شاید میرا ہی نام متھراداس ہے اور میں مہاجن ہوں۔'' (بغل میں رجسٹر کی جانب اشارہ کر کے بے چارگی سے دیکھتے ہوئے)

سپاہی: کوتوال نے بلایا ہے۔

متھراداس: ''کوتوال؟۔۔۔'' خوف زدہ ہو کر ''چھوڑ و مجھے، ہٹو جی۔۔۔ وہ کوئی اور ہوگا'' (سپاہی کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک کر چلتا ہے)

سپاہی بھی ساتھ ساتھ دونوں طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

متھراداس: (دونوں طرف دیکھتے ہوئے) کیا کام ہے؟

سپاہی: (رعب سے) یہ وہیں پتہ چلے گا!

ڈرپوک مہاجن رُک کر ہاتھ جوڑتے ہوئے اور تقریباً رو کر کہتا ہے۔

متھراداس: مجھے چھوڑ دو، مجھے اپنا چھوٹا سا گھر ہی پسند ہے۔

سپاہی اُسے پکڑ کر کھینچتے ہوئے چلتے ہیں۔

متھراداس: (روہانسا ہو کر) میں چور نہیں۔۔۔ چور کا بھائی نہیں۔ فیڈ آؤٹ

سین نمبر ۴۰ (کوتوالی)

سپاہی مہاجن کو پکڑے کوتوالی کے گیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔

متھراداس: ''چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔۔۔ میں بالکل بے قصور ہوں،'' سپاہی کے دھکیلنے پر ''کسی کی چوری نہیں کی، ڈاکا نہیں ڈالا، عورت نہیں بھگائی۔۔۔ میں تو غریب بال بچے دار آدمی ہوں۔''

سپاہی: (کالر سے پکڑے ہوئے) چل اندر

اُسے اندر کمرے میں لے جاتے ہیں جہاں دفتر میں کرسی پر کوتوال بیٹھا ہے اور سامنے ایک بڑی سی میز ہے۔

سپاہی: حضور مہاجن حاضر ہے۔

ڈرا ڈرا سا مہاجن بھی ساتھ ہی دہراتا ہے ''مہاجن حاضر ہے''

کوتوال حشمت خاں: ''گھبرایئے نہیں مہاجن صاحب،'' تیکھی مسکراہٹ سے ''کسی جرم کی پاداش میں نہیں، یونہی پوچھ گچھ کے لیے بلایا ہے آپ کو، بیٹھیے۔'' (کرسی کی طرف اشارہ)

متھراداس: (سکھ کا سانس لے کر) ''ہٹ پرے مر، مردود'' سپاہی کی گرفت سے آزاد ہو کر، جوش سے ''میں پہلے ہی کہتا تھا، بالکل بے قصور ہوں۔ (آسمان کی طرف نگاہ کر کے) کوتوال صاحب انصاف پسند، بادشاہ عدل گیر۔۔۔ کوتوال صاحب فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

کوتوال کو اس کی خوشامدی انداز پر ہنسی آجاتی ہے۔

کوتوال: (ہنستے ہنستے) ''بیٹھیے بیٹھیے۔'' اور سپاہیوں کی جانب دیکھ کر ''تم لوگ جاؤ''

مہاجن مکاری ہنسی ہنس کر ایک کرسی پر محتاط سا بیٹھ جاتا ہے۔

کوتوال: ایک بات تو بتایئے۔

متھراداس: فرمایئے، فرمایئے۔

کوتوال: (مہاجن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے) آپ مرزا کو روپیہ قرض دیتے ہیں؟

متھراداس: جی، جی نہیں، جی نہیں۔

کوتوال: (کاغذ میز سے اُٹھا کر) نہیں؟

متھراداس: (سہم کر) جی، جی ہاں دیتا ہوں۔۔۔ مگر روپیہ قرض دینا جرم تو نہیں کوتوال صاحب۔

کوتوال: ''بے شک نہیں۔'' غصے سے اُس کی طرف انگلی اُٹھا کر ''مگر آپ مرزا سے سود بھی لیتے ہیں۔''

متھراداس: (ہنس کر) بن سود جی روپیہ قرض دیا جاتا ہے؟

کوتوال: ''سود کی حد ہوتی ہے مہاجن صاحب!'' گہری نظر سے دیکھتے ہوئے ''دکھایئے اپنا بہی کھاتہ۔''

متھراداس: ''جی؟۔۔۔'' ڈرے ہوئے اپنے رجسٹر کی طرف اشارہ کر کے۔ ''جی اس میں کچھ ذرا زیادہ ہی لکھا گیا ہے۔'' (اور جلدی سے ہاتھ جوڑ کر) ''مگر مجھے اصل بھی مل جائے تو میں سود چھوڑ دوں گا سرکار۔''

کوتوال: تو مرزا کی طرف جو روپے نکلتے ہیں آپ میری جیب سے لے جایئے اور اُن کے نام جو تمسک ہے، وہ مجھے بیچ ڈالیے۔

متھراداس: جی؟ (حیران ہو کر)

مگر فوراً ہی کوتوال حشمت خاں ہنستا ہے، ساتھ ہی مہاجن بھی ہنس دیتا ہے۔

کوتوال: ''گھبرایئے نہیں مہاجن صاحب!'' تشفی کے انداز میں ''مرزا صاحب میرے دوست ہیں اور میں نہیں چاہتا، پیسے کی ادائیگی کے بارے میں کوئی اُنہیں پریشان کرے۔''

متھراداس: ''بڑا ہی نیک خیال ہے آپ کا حضور۔۔۔'' فوراً ہی رجسٹر میز پر رکھتا ہے۔ چہرے سے خوشی عیاں ہے۔ چھتری کو میز کے پاس ٹکا دیتا ہے اور رجسٹر کا فیتہ کھولتے ہوئے، خود کلامی کے انداز میں ''یہ، مجھے کیا پیسے مل جائیں تو سمجھوں گا نہائے۔۔۔ یہ رہا مرزا کا تمسک۔۔۔ یہ دستخط کر دیں۔''

اُٹھ کر تمسک کوتوال کو پیش کرتا ہے۔ کوتوال ایک نظر دیکھ کر اُس کاغذ پر دستخط کر دیتا ہے۔ مہاجن رجسٹر کا فیتہ دوبارہ لپیٹ دیتا ہے اور کوتوال کی طرف بے یقینی سے دیکھتا ہے۔

کوتوال: جایئے، پیسے آپ لے لیجیے (اشارہ ملحقہ دفتر کی جانب ہے)

متھراداس مہاجن مطمئن ہو کر رجسٹر اور چھتری پکڑے کرسی سے اُٹھتا ہے۔

متھراداس: شکریہ، آداب (چلتے ہوئے)

حشمت خاں، اُسے باہر جاتا دیکھ رہا ہے۔

کوتوال حشمت خاں: (زہر خند سے) ''بدلہ اب میں لوں گا۔۔۔ خاک سیاہ کر کے نہ رکھ دوں تو حشمت خاں نام نہیں۔''

مہاجن سے وصول کیے ہوئے کاغذ کو پھڑ پھڑاتا ہے۔ کیمرہ حشمت کا چہرہ کلوز لیتا ہے۔ (فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۱۴۱ (کمرۂ عدالت کا منظر)

عدالت کا سرکاری ہرکارہ آواز لگاتا ہے۔ ''مرزا اسداللہ خاں غالب ولد عبداللہ خاں بیگ حاضر ہیں۔''

مرزا غالب کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہیں اور جا کر کٹہرے میں کھڑے ہو کر مفتی شہر کو آداب بجالاتے ہیں۔ خاصی تعداد میں لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوتا ہے۔

مفتی صدرالدین آزردہ: مدعا الیہ عدالت میں اقرار کرے یا انکار کہ اُس کو روپیہ متھراداس مہاجن کا ادا کرنا ہے؟ جس کا تمسک کوتوال شہر حشمت خاں نے خرید لیا ہے۔

مرزا غالب: ہاں حضور، میں اقرار کرتا ہوں۔

صدرالدین: مدا الیہ یہ بھی بتایئے کہ باوجود متعدد تقاضوں کے وہ روپیہ ادا نہ کر سکا۔

مرزا غالب: جی حضور۔

کیمرہ مرزا سے مفتی صاحب پر آتا ہے۔

صدرالدین: تو معیاد چھ مہینے کی گزر چکی ہے؟

مرزا غالب: جی۔

صدرالدین: ''لہٰذا قانون کی رو سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔''قلم اُٹھا کر لکھتے ہوئے''کہ مدعاالیہ مدعی کو شام تک مبلغ دو ہزار روپے ادا کرے اور تمسک چھڑا لے۔۔۔''مرزا کی طرف دیکھ کر''بصورت عدم ادائیگی مدعاالیہ کو چھ مہینے کی قید کا حکم سنایا جاتا ہے۔''

مرزا غالب: (پریشان ہو کر استدعا کرتے ہوئے) سرکار ایک دن کی بھی مہلت نہ ملی؟

صدرالدین: (گمبھیر لہجے میں) عدالت کا فیصلہ برحق ہے۔

مرزا غالب: ''میں تو کسی طور ادا نہ کر سکوں گا۔''بے بسی سے''میرا آج سب کچھ بک جائے تب بھی دو ہزار روپیہ نہ نکلے گا۔''

کیمرہ قریب کرسی پر بیٹھے کوتوال پر ہے جس کے پیچھے سپاہی کھڑے ہیں۔کوتوال قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھتا ہے۔

کوتوال: پھر قید کے احکام جاری کردیئے جائیں (عدالت سے درخواست)

کوتوال کے اشارے پر سپاہی حرکت کرتے ہیں۔صدرالصدور سپاہیوں کو رکنے کا اشارہ نہیں کرتے۔ وہ مرزا کی جانب بڑھتے ہیں کہ صدرالصدور میز پر وزن مارتے ہیں۔

مفتی صدرالدین:''میں، مفتی صدرالدین اپنی شخصی حیثیت میں مدعاالیہ کی طرف سے دو ہزار روپیہ عدالت میں داخل دفتر کرتا ہوں۔''اور مسکراتے ہوئے مرزا کی طرف دیکھتے ہیں۔

کیمرہ حیران و پریشان مرزا غالب پر ہوتا ہے اور عدالت برخواست کردی جاتی ہے۔

بالمقند حضور روپوں کی تھیلی لاکر مفتی صاحب کی میز پر رکھتے ہیں۔مرزا تیزی سے کٹہرے سے نکل کر بالمقند حضور کے گلے لگ جاتے ہیں۔کیمرہ کٹ کر کے کوتوال کو فوکس کرتا ہے جو پیچ و تاب کھاتا کمرۂ عدالت سے نکل جاتا ہے۔

سین نمبر ۴۲ (کمرۂ عدالت)

مفتی صدرالدین عدالت سے متصل کمرے میں اپنا گاؤن اُتار رہے ہیں۔کیمرہ بالمقند حضور پر آتا ہے۔پاس نواب شیفتہ بھی ہیں۔

بالمقند حضور: ''مسئلہ تو حل ہوا۔''مرزا سے کہتے ہوئے''یہ تو بتایئے کہ آپ اتنے پیسوں کا کرتے کیا رہے۔''

مرزا غالب: (شرمندہ سے) ''کیا بتائیں صاحب!۔۔'' سب عدالتی کمرے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔شیفتہ بھی ہیں۔

قرض کی پیتے تھے مے ،لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

شعر کی ایسی آمد پر بالمقند حضور مسکرا دیتے ہیں اور صدرالدین آزردہ ''بہت خوب، بہت خوب'' داد دیتے ہیں۔

مرزا غالب: (آزردہ کی طرف رُخ کر کے) ''مفتی قبلہ! آج آپ نے مجھے حلقہ بگوش کر لیا۔'' اور ہاتھ ملتے ہوئے ''میں آپ کی نوازشوں کو کیا کہوں۔''

صدرالدین: (کچھ خفگی سے) مرزا صاحب آپ کیا کہتے ہیں۔میں اتنا بے غرض بھی نہیں ہوں۔''

مرزا غالب: (احسان مندی سے) اور کیا غرض ہو سکتی ہے مجھ فقیر سے۔

صدرالدین: (مسکراہٹ دبائے) میرے بھائی کے ہاں لڑکے کی شادی ہو رہی ہے۔راگ رنگ کی محفل ہوگی اور مشاعرہ بھی۔۔۔

بالمقند حضور: (بات اُچک کر مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے) اس لیے اتنی (بڑی) رشوت؟

مرزا غالب: (نظر نیچی کرتے ہوئے) دوستوں نے بھاؤ بڑھا دیا۔

اس نوک جھونک پر سب خوش مزاجی سے ہنستے ہیں۔

صدرالدین: کیا کریں آپ کی وضع داری سے ڈرتے ہیں، بازار میں غزل کی قیمت نہیں۔۔۔ مشاعروں میں بھی کم ہی شریک ہوتے ہیں، لہٰذا یہ چھوٹی سی خوشامد منظور ہے۔ تشریف لائیے گا۔(تخاطب مرزا غالب)

مرزا غالب: شکرانہ بجالاؤں گا (تشکر سے)

صدرالدین: بہت بہت شکریہ

سین نمبر۴۳ (صدرالدین آزردہ کے بھتیجے کی شادی کی تقریب)

شادی والے گھر میں شرکا تقریب میں شاعر حضرات، حکیم مومن خاں مومن، بالمقند حضور، نواب شیفتہ، محمد علی تشنہ، آغا جان عیش اور میر مجلس صدرالدین آزردہ کے ہمراہ مرزا غالب بھی کرسیوں

پر تشریف فرما ہیں۔ ایک رقاصہ رقص کر رہی ہے۔ ملازم بھی بیچ سے گزرتے جاتے ہیں۔ خادم پنکھا جھل رہا ہے، زنان خانے میں پردے سے خواتین بھی رقص دیکھ رہی ہیں۔ اُن میں چودھویں بیگم بھی مغنیہ کے طور پر موجود ہے۔ چودھویں بیگم ایک کاغذ کا ٹکڑا ملازمہ کو دے کر روانہ کرتی ہے۔ رقاصہ کے ناچ گانے کا اختتام ہوتا ہے ''واہ، واہ'' اور ''بہت خوب'' سے اُسے داد ملتی ہے۔ چلمن کی اوٹ سے آنے والی خادمہ، ایک پلیٹ صدر الدین آزردہ کے سامنے کرتی ہے۔ آزردہ اُس میں رکھی ہوئی چٹ اُٹھاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے۔

صدر الدین آزردہ: دوستو، اندر سے فرمائش آئی ہے کہ مرزا نوشا اپنی یہ غزل سنائیں۔

ع عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی

''ضرور ضرور'' کی آوازیں۔۔۔ مرزا غالب ذرا توقف سے اُٹھتے ہیں۔

مرزا غالب: صاحبو! غزل پرانی ہے پھر بھی صاحب فرمائش کو سلام کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں (پلے بیک سنگر طلعت محمود کی آواز)

ع عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی

صدر الدین مصرع دہراتے ہیں۔ سبحان اللہ، واہ واہ، واہ واہ۔

ع میری وحشت ، تیری شہرت ہی سہی

(سبحان اللہ، واہ واہ، کیا کہنے۔۔۔ بہت اچھے، آہا)

ے قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے ، تو عداوت ہی سہی

کیمرہ خواتین پر جاتا ہے، ایک خاتون واہ واہ۔۔۔ چودھویں بیگم بھی ہمہ تن گوش ہیں۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق ، مصیبت ہی سہی

حاضرین واہ، سبحان اللہ، واہ واہ داد دیتے ہیں۔

چودھویں: مرزا صاحب آہ، مرزا صاحب (والہانہ پکارتی ہے)

خاتونِ خانہ: اے کیا کرتی ہے یہ لڑکی (چودھویں بیگم کی جسارت پر خفگی کے ساتھ۔)

مرزاغالب: اگلا شعر ہے۔۔۔ذرا ٹھہریئے میں بھول گیا۔
چودھویں پردے کے اندر سے لب کشا ہوتی ہے۔
چودھویں بیگم: میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
مرزاغالب: یا اللہ۔۔۔(یاد آجانے کا تاثر)
خاتونِ خانہ: تم بیچ میں کیوں بولتی ہو جی! (چودھویں کو جھڑکتی ہیں)
مرزاغالب: میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں ، خلوت ہی سہی
(واہ واہ سبحان اللہ کیا کہنے)
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ!
گر نہیں وصل ، تو حسرت ہی سہی
غزل سرائی کے بعد غالب داد و تحسین سمیٹتے ہوئے صدرالدین کی طرف بڑھتے ہیں۔
مرزاغالب: مفتی صاحب! قبلہ میں چلوں گا۔
صدرالدین آزردہ: (کھڑے ہوکر) کیا بات ہے مرزا؟
مرزاغالب: ''میرا جی اچھا نہیں ہے۔'' اجازت طلب انداز میں ''میں معافی چاہتا ہوں۔''
دوسری جانب اندرونِ خانہ میں چودھویں بیگم بھی رخصت لیتے ہوئے۔
چودھویں بیگم: بیگم صاحبہ مجھے معاف کر دیجیے میں چلوں گی۔
خاتونِ خانہ: ''کہاں چلوگی؟'' اور کھٹور لہجے میں ''پچاس ٹکے دیے ہیں، واپس کر دو تو جاؤ۔''
چودھویں ہاتھوں کے کنگن اُتار کر دیتے ہوئے۔
چودھویں: ''یہ لیجیے! میری طبیعت اچھی نہیں'' یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکلتی ہے۔

سین نمبر ۴۴

مرزاغالب شادی والے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ دوسرے دروازے سے پیچھے چودھویں بیگم بھی۔۔۔مرزا صاحب آگے آگے، چودھویں پیچھے پیچھے۔ غالب کی جانب لپکتے ہوئے پکارتی ہے۔

چودھویں: مرزا جی، اے مرزا جی!

مرزا رکتے ہیں اور دیکھ کر حیرانی سے چودھویں کی جانب پلٹتے ہیں۔

مرزا غالب: چودھویں بیگم تم؟

چودھویں: جی میں، ہمیشہ آپ کو پکارنے والی۔۔۔اور آپ ہمیشہ طرح دے کر نکل جانے والے (دونوں چلتے ہوئے)

مرزا غالب: یہ بات نہیں چودھویں بیگم، میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا۔ مبارک باد دینا چاہتا تھا شادی کی۔

چودھویں: ہاں مرزا صاحب! آپ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔ (انداز میں شکوہ)

مرزا غالب: کیا مطلب؟

چودھویں: ''کیا مطلب۔'' مرزا کا فقرہ دہرا کر'' آپ یہ پوچھتے ہیں، ڈھولک بجی، مہندی سجی، میں آپ کا نام لے لے کے جی مگر یہ لیسے دینے کے سمبندھ ن آپ جب بھی آئے آسمان نے ایسی چال چلی کہ آپ کے پاس آتے آتے دور ہو گئی۔۔۔اُس رات بھی آپ کو حشمت سمجھ بیٹھی اور کیا کچھ کہہ دیا۔ جب ہی پتہ چلا۔ میرا مقصود آیا تھا۔ مجھ سے ایک ہاتھ کی دوری پر کھڑا تھا۔۔۔ میں نصیبوں جلی نے ہاتھ بھی نہ پھیلایا۔ پھر بہت پکی جھجکی مگر۔۔۔

مرزا غالب: (بات قطع کرتے ہوئے) چودھویں، میرے لیے لپک جھپک کی کیا ضرورت تھی؟ میں ایک بے کار، بے مصرف آدمی، البتہ شعر کہہ لیتا ہوں جو کسی کو پسند نہیں آتے۔

چودھویں: ''میرے ہوتے تو ایسا نہ کہیے مرزا جی'' مرزا کا ہاتھ پکڑ کر'' آپ کے شعر اور آپ ہی تو میرا سب کچھ ہیں۔''

مرزا غالب: ایسی بات نہ کرو چودھویں!۔۔۔ مجھے گناہگار نہ بناؤ۔ میں پہلے ہی دل اور دماغ کی کشمکش میں مرا ہوں۔ دل مجھے تمہاری طرف لے جاتا اور۔۔۔

چودھویں بیگم: ''مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔'' خوشی کے جذبات سے پاؤں میں بیٹھ جاتی ہے۔ مرزا کے ہاتھ کو پکڑ کر رخسار سے لگاتی ہے اور آنکھیں اوپر اٹھا کر مرزا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے۔'' میں جو چاہتی ہوں، مجھے وہ مل گیا، ایک تمنا ہے میری، میرے

ہاں آ ہئے ایک بار۔۔۔ میں دیکھوں تو جب ازلی وابدی دولہا آتا ہے تو زمانے کی دلہن کیا محسوس کرتی ہے۔ کیسے مرجاتی ہے وہ خوشی سے۔''

مرزا غالب: ''چودھویں''۔۔۔(اُسے پاؤں سے اُٹھاتے ہوئے)''میں کل آؤں گا۔ کل ہی آؤں گا۔''

چودھویں: ''کل، یعنی آج اور کل، ضرور آیئے گا۔ میں پل پل آپ کی راہ دیکھوں گی۔''

غالب رخصت ہوجاتے ہیں۔ آگے جاکر مڑکر پیچھے دیکھتے ہیں اور ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور چودھویں خوشی سے آسمان کی جانب دیکھتی ہے۔

سین نمبر ۴۵ (ان ڈور)

چودھویں بیگم سولہ سنگھار کیے تیاری میں، نقرئی کلائیوں میں چوڑیاں پہن رہی ہے۔

سین نمبر ۴۶ (مرزا کا گھر)

مرزا غالب بھی باہر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

امراؤ بیگم: مَیں کہتی ہوں جیسے آپ مجھے اچھے لگتے ہیں ویسے ہی دوسروں کو لگیں۔

مرزا غالب: (واسکٹ پہن کر بٹن بند کرتے ہوئے) کون دوسرا؟ تمہیں پتہ ہے میں کہاں جارہا ہوں۔۔۔ کہیں گرمی پڑی ہے۔ بخارات اُٹھتے ہیں اور آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ تمہیں دُکھ کس بات کا ہے۔ (پاس بیٹھی بیوی کی طرف دیکھتے ہیں)

امراؤ بیگم: ''دُکھ نہیں''، افسردہ لہجے میں''مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کی دل بستگی کا سامان نہ ہوسکی۔ آپ کے شعروں کی جان نہ ہو پائی۔ جب سے میرے پاؤں اس گھر میں پڑے ہر بار ہی بڑے دے دے کے اولاد ہوتی ہے۔'' (میاں کے پاؤں میں موجڑی (جوتے) پہناتے ہوئے آنکھیں اوپر اُٹھا کر''ایک بات کہوں، مانیئے تو!''

مرزا غالب: کہو۔

امراؤ بیگم: (مرزا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) آپ دوسری شادی کر لیجیے۔

مرزا غالب: ''بیگم'' گھور کر''نہیں''، دوسری طرف رُخ موڑ لیتے ہیں۔''نہیں!''

پھر کمرے میں جاکر تخت پوش پر بیٹھ جاتے ہیں۔''اللہ کیا کروں۔ ایک نے میرا ساتھ دیا، دوسری نے میرا دل لیا۔۔۔ ایک ایثار کی تپلی، دوسری محبت کا فرشتہ نہیں۔۔۔''

دروازے سے گزر کر شکستہ سے، برآمدے کے ستون سے لگ کر، کوئے یار جانے میں تساہل۔۔۔دل سے غزل کی صورت آ نکلتی ہے۔ (آوازیں، طلعت محمود، ثریا)

مرزا غالب: ؎ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

دوسری جانب بیمارِ دل چودھویں بھی مرزا کے نہ آنے پر سراپا آہ و فغاں ہے۔ آواز میں بڑا ازخیز کرب ہے۔

چودھویں: ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

مرزا غالب: (دہراتے ہوئے) ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

چودھویں: ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مرزا غالب: ؎ مَیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

چودھویں: ؎ ہم سے اُن کو وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

مرزا غالب: ؎ جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

چودھویں: ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹے، غالب شعر کا دوسرا مصرعہ ادا کرتے ہیں۔

ع آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

کیمرہ وسیع و عریض صحن کو فوکس کرتا ہوا۔

سین نمبر ۴۷ (بالا خانہ)

چودھویں بالا خانے کی شہ نشین میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی ہے۔ ماں آتی ہے۔

ملکہ جان: ''موتی، مو۔۔۔'' رُک جاتی ہے۔ گہری سوچ میں گم چودھویں کو دیکھ کر ماں شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔

چودھویں بیگم: ''مرزا جی۔'' ڈھلکے ہوئے لہجے میں۔''اماں مرزا جی نہیں آئے۔'' (اس ایک فقرے میں دنیا جہان کا درد سمایا تھا۔)

ملکہ جان: ''وہ کیا آئے گا'' سمجھانے والے انداز میں ''تو خالی خولی انتظار کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔مرتی رہتی ہے۔۔۔ایسے بے مہر کے پیچھے پڑی ہے جو تجھے پوچھتا بھی نہیں۔

چودھویں بیگم: یہ بات نہیں۔میں جانتی ہوں وہ کیوں نہیں آئے۔جب سے مشاعرے میں اُن کی سبکی ہوئی۔انہیں اپنا آپ، اس دنیا میں سب کچھ رکھا بیکار محسوس ہوتا ہے۔

ملکہ جان: اونہہ۔

موتی، موتی کی آوازیں اور تین چار لڑکیاں کمرے میں داخل ہوتی ہیں اور موتی عرف چودھویں بیگم کے گرد ہالہ بنا لیتی ہیں۔

پہلی لڑکی: کل پھول والوں کی سیر ہے۔موتی تم نہ چلوگی ہمارے ساتھ؟

دوسری لڑکی: مرزا شاہ رُخ تختِ رواں پر سوار نکلیں گے۔

تیسری لڑکی: ولی عہد پاینک جھانگ میں آئیں گے۔

چوتھی لڑکی: بادشاہ سلامت محل سے جلوس فرمائیں گے۔

چودھویں بیگم: ''بادشاہ'' خوش ہو کر ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ''اماں میں سیر پہ جاؤں گی۔'' اور جھوم کر ''وہاں ناچوں گی، گاؤں گی، بادشاہ کو بتاؤں گی کہ مرزا کتنے بڑے شاعر ہیں۔''

ملکہ جان: ''خبردار۔۔۔گرہستی اپنی بیسوا ہے جو ناچے گی گائے گی؟ خبردار۔۔۔ناچے گی، گائے گی۔'' کٹیلے لہجے میں چودھویں کے قریب جا کر ''کچھ تو حیا کر۔''

چودھویں بیگم: میری حیا کیسی اماں! میری حیا میرے سہاگ کی باندی۔

ملکہ جان: ''کون سہاگ کیسا سہاگ؟'' آگ بگولہ ہوتے ہوئے۔''شرم نہیں آتی۔۔۔میں جانے نہ دوں گی۔سمجھی!''

چودھویں بیگم: نہیں۔۔۔میں ضرور جاؤں گی!

ملکہ جان: ''موتی!'' حیرانی سے ''موتی'' (فیڈ آؤٹ)

سین نمبر ۴۸ (لال قلعے کا منظر)

قلعے کے دروازے پر چوبدار کھڑے ہیں۔راہ گزر پر ایک بیل گاڑی رواں ہے۔محل کی

شہ نشینوں میں لڑکیوں کا جمگھٹا ہے۔ اندر شاہی نشست گاہ میں بادشاہ براجمان ہیں۔ باندیاں پنکھا جھل رہی ہیں۔ کنیزیں آس پاس ہیں۔ بادشاہ سلامت کی جانِ من زینت بیگم داخل ہوتی ہے اور کہتی ہے:

زینت بیگم: ''خبر آئی ہے حضور ہندوؤں کا پنکھا جمنا سے ایک کوس رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کا پنکھا درگاہ شریف سے ڈیڑھ کوس ادھر ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہیں۔ خوشیوں پنکھوں میں شریک ہو رہے ہیں۔'' اور تخت کے کونے پر بیٹھ کر بادشاہ کے اُداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''میں واری، حضور کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے؟''

بادشاہ نفی میں سر ہلاتے ہیں۔

زینت بیگم: تو پھر کیا راز ہے؟۔۔۔ آپ کچھ فرماتے نہیں، کیا مجھ بندی سے کچھ۔۔۔

بہادر شاہ ظفر: نہیں زینت!

زینت بیگم: ''کیا وجہ ہے اس تبدیلی کی۔۔۔؟'' اور باہر روشوں کا نظارہ کرتے ہوئے ''زمین آسمان سب مخمل کے بنائے گئے ہیں، جھرنوں کی چادریں گر رہی ہیں، حوروں کی جھنکار ہے۔ پپیہے کی پکار ہے۔'' اور پھر تعظیم سے اُٹھ کر ''حکم ہو تو۔۔۔ خانم، دلدار کو بلواؤں، ملہار سناؤں''

بہادر شاہ ظفر: نہیں زینت! آج مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔

زینت بیگم: قربان جاؤں۔۔۔

آپ کے دل کے آئینے پہ بال ہو گا
تو ہم رعایا کا کیا حال ہو گا

بہادر شاہ ظفر: یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔۔۔ باپ دادا نے یہ سلطنت بنائی۔ چاروں اور پھیلائی۔ اب غیر ملکی ''حکمران'' ہو گئے۔۔۔ میں سوچتا ہوں کیا ہمارے بعد یہ سیریں، یہ بہاریں رہیں گی یا جھرنوں اتھبوں کا صرف نام ہی رہ جائے گا۔ (توقف سے شہادت کی انگلی اوپر کی جانب اُٹھا کر) سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ اور تسبیح کرتے ہوئے حکمیہ ''اس وقت تم مجھے چھوڑ دو، میں تخلیہ چاہتا ہوں''

زینت بیگم: جوارشاد۔ (کہہ کر چلی جاتی ہے)

سین نمبر ۴۹ (لال قلعہ، باغ باغیچے، سبزہ زار)

زینت بیگم محل میں بیٹھی ہیں۔ ان کے گرد قطار میں باندیاں اور کنیزیں کھڑی ہیں۔ دوسری قطار میں سیر پر آنے والی رقاصائیں ہیں۔

حاجرہ: کیا بات ہے بیگم صاحبہ آپ رو رہی ہیں؟

زینت بیگم: ''کیا کروں حاجرہ آج میں نے ظل سبحانی کا وہ رنگ دیکھا ہے جو کبھی نہیں دیکھا۔ بہت دل گیر بیٹھے ہیں۔۔۔ ہزار ترکیب کی جی بہلانے کی مگر ہر بار طرح دے گئے۔'' (اور اپنے گرد لڑکیوں کے جمگھٹے کو دیکھتے ہوئے) ''ان لڑکیوں کو کیا ہوا۔ کوئی ناچے گائے، شاید طبیعت مائل ہو اُن کی۔''

اُن میں سے ایک رقاصہ لڑکی جھوم کر نکلتی ہے۔ سرسبز شاداب نظارے میں حوض کے دونوں اطراف کی روشوں پر لڑکیوں کی ٹولیاں جو ناچتی گاتی رقص کرتی ہیں۔ (کورس)

گنگا کی ریتی پہ، بنگلہ اُٹھوائی دے
سیّاں تیری خیر ہو جی بلما تیری خیر ہو

کھڑکی کی اور کوئی بگیا لگائی دے
پھولوں کی سیر ہو جی بلما تیری خیر ہو جی

(بادشاہ کو لبھاتے ہوئے جو اس رنگ و آہنگ سے لاتعلق سے بیٹھے ہیں)

اوہ نینوں سے نین ملیں، باتیں ہوں پیار کی
پائل کے ساتھ بجے بانسری بہار کی
اک تو ہو ایک میں ہوں، کوئی نہ غیر ہو
سیّاں تیری خیر ہو، بلما تیری خیر ہو

(سب لڑکیاں دہراتی ہیں) سیاں تیری خیر ہو، بلما تیری خیر ہو۔

پھر اس رقص کا آہنگ تبدیل ہو جاتا ہے ایک طرف سے چودھویں بیگم حوض کی روش پر نمودار ہوتی ہے اور اپنی نغمہ بار آواز میں غالب کی ایک غزل چھیڑتی ہے۔ (آواز ثریا)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
(بادشاہ اس رنگِ تغزل کو حیرانی سے دیکھتے ہیں)
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

بہادر شاہ ظفر: (بے ساختہ) واہ، سبحان اللہ۔۔۔کون لڑکی ہے یہ؟

خادم: (جو بادشاہ کے پیچھے کھڑا ہے) دلّی کی مشہور ڈومنی ملکہ جان ہے۔ اُس کی بیٹی ہے حضور۔۔۔چودھویں بیگم کہلاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر: آواز میں نور، شاعری میں سرور۔۔۔
اور مغنیہ چودھویں نغمہ سرا ہے۔

~ غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگ علاج؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شعر و سخن کی ایسی نادرہ کاری پر بادشاہ کی طبیعت میں سرشاری آجاتی ہے۔ چودھویں اُن کے حضور پیش ہوتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر: چودھویں بیگم یہ تمہاری نذر (انعام دیتے ہوئے)

چودھویں بیگم: حق دار تو وہ ہے حضور جس کا یہ کلام ہے۔

بہادر شاہ ظفر: کہو انہیں جب دربار لگے، چلیں آئیں۔

سین نمبر ۵ (شاہی دربار)

درباری کھڑے ہیں۔ معززین کرسیوں پر تشریف فرما ہیں اور بادشاہ سلامت تخت نشیں ہیں۔ غالب آداب بجالاتے ہوئے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر: ''ہم آپ کے شعروں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، آپ کے کلام معجزان کی حیثیت اور اس کے بلند مرتبہ کے سامنے سرِتسلیم، انعام کے علاوہ خلعت والقابات سے سرفراز کرتے ہوئے، خلعت اور انعام کے علاوہ نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظامِ جنگ کے خطابات سے مستفید کرتے ہیں۔۔۔آج سے آپ دربار کے

شاعر خصوصی ہیں۔ شہزادے آپ سے تلمذ کیا کریں گے۔''

بادشاہ بہادر شاہ ظفر نشست سے اُٹھتے ہیں۔ سب سر جھکائے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ چل کر غالب کی طرف آتے ہیں۔ وہاں معززین اور شعرا حضرات، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم مومن خاں مومن، بالم قد حضور، نواب شیفتہ، محمد علی تشنہ، حکیم آغا جان عیش بھی ہیں۔ خلعت بادشاہ کے قریب لائی جاتی ہے۔

مرزا غالب: پیرو مرشد ظلِ سبحانی میں اس عنایت کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ میں اور میری آل اولاد اس بخشش میں حضور کی جان و مال دعا گو ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

بادشاہ خلعت پہناتے ہیں۔ ''مبارک'' اور ''مبارک ہو'' کا شور اُٹھتا ہے۔

سین نمبر ۱۵ (چودھویں بیگم کا گھر)

قدن میاں بیٹھے ہیں۔ چودھویں بیگم پاس آتی ہے۔

قدن: (چہک کر) آج تو منہ میٹھا کروا دو۔ کھلاؤ ریوڑیاں۔۔۔

چودھویں بیگم: ''کچھ بولے گا بھی کہ یونہی کہے جائے گا۔ کھلاؤں یونہی ریوڑیاں۔'' اور نشست پر بیٹھتے ہوئے ''بتا کیا بات ہے؟''

قدن: تیرے مرزا کو حضور بادشاہ سلامت نے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظامِ جنگ کا خطاب عنایت کیا ہے۔

چودھویں بیگم: ''سچ'' (حیرانی سے)

قدن: اور خلعت اور انعام و کرام سے مالا مال کر دیا ہے۔

چودھویں بیگم خوشی سے کھڑی ہو جاتی ہے۔

قدن: چاندی کی کٹوریاں دی ہیں، وظیفہ باندھ دیا ہے اور شہزادے کا اتالیق مقرر کر دیا ہے۔

چودھویں بیگم: (دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے) اللہ تیرا شکر ہے۔

قدن: ''اور جانتی ہو یہ سب کس کی بدولت ہے؟'' کھڑے ہو کر ''تمہاری!''

چودھویں بیگم: نہ قدن میاں، ایسی کفر کی نہ کہو۔ یہ تو اُن کا کلام ہے جسے دنیا سلام کرتی ہے۔۔۔

یہ تو اللہ کی دین ہے۔ مَیں تو دعا کرتی ہوں اُن کا اقبال دونا ہو چوگنا ہو۔ مَیں تو جشن مناؤں گی۔ سہیلے گاؤں گی۔

فدن: وہ اب ہمارے ہاں ضرور آئیں گے، تب جشن منانا، سہیلے گانا۔

چودھویں بیگم: ہاں فدن میاں اُن کے لیے مَیں گھر سجاؤں گی۔ غریب غربا کو کھلاؤں گی۔ نہ جانے کیا کیا کروں گی۔۔۔

اورانبساط وخوشی کی کیفیت میں اندر بھاگ جاتی ہے۔

سین نمبر ۵۲ (سرِراہ)

صدرالدین آزردہ: ہم تو جانتے تھے کہ ایک دن یہ ہو کے رہے گا۔

نواب شیفتہ: مگر اُس کا شکریہ تو ادا کر دو۔

مرزا غالب: کس کا؟

نواب شیفتہ: جس نے بادشاہ سے تمہاری سفارش کرا دی۔

مرزا غالب: ''ارے وہ!۔۔۔'' (تخاطب صدرالدین اور نواب) ''اجی وہیں جا رہا ہوں بھائی۔''۔۔۔اور ہوادار والے کی طرف منہ کر کے۔ ''چلو کومیاں''

شعر احضرات سے اجازت کے انداز میں۔ بیوی پالکی میں بیٹھی ہوئی ہے۔

مرزا غالب: (بیوی سے) اتنی خوشی ہے کہ رو رہی ہو۔

امراؤ بیگم: ''زندگی کا نام ہی رونا ہے، غم ہو تو رونا خوشی ہو تو رونا'' پالکی کے پردے میں سے یاسیت سے ''مَیں آپ ایسے کے قابل کہاں، اب بھی مجھے قدموں سے لگائے رکھو گے؟

مرزا غالب: ''بیگم کیا بات کرتی ہو تم۔۔۔'' محبت بھرے لہجے میں ''تم تو میری۔۔۔''

امراؤ بیگم: (جلدی سے) گھر چلیں!

مرزا غالب: ''ہاں ہاں چلو بھئی۔'' اور ہوادار میں ساتھ بیٹھتے ہوئے ''اُٹھاؤ بھئی۔'' ہوادار اُٹھتے لمحے مرزا کہاروں سے مخاطب۔ ''خیال سے۔۔۔''

سین نمبر ۵۳ (کوتوالی)

کوتوال حشمت خان اور نوشاد علی بیٹھے ہوئے ہیں حشمت خان غصے میں پھنکار رہے ہیں۔

''نجم الدولہ۔۔۔دبیر الملک۔۔۔نظامِ جنگ''

حشمت خاں: نوشاد علی! کیا سوچا تم نے مرزا کے بارے میں۔(چنگاڑتے ہوئے)

نوشاد علی: مگر کوئی ترکیب نہ سوجھی، میں لاکھ سر پٹکا مگر کوئی ترکیب نہ آئی۔

حشمت خاں: کیا سوجھے گی؟۔۔۔اب تمہاری پھونکوں سے یہ چراغ نہ بجھے گا۔

نوشاد علی: ایسی بات نہیں سرکار۔۔۔میں تو پوری کوشش کر رہا ہوں۔

حشمت خاں: خاک کوشش کر رہے ہو۔

سپاہی: ''حضور''۔۔۔ کیمرہ دروازے کی طرف جاتا ہے۔سپاہی مطلع کرتا ہے۔''دس جواری ڈگری سے پکڑے ہیں۔''

حشمت خاں: مارو جوتے۔حوالات میں بند کرو۔کل عدالت میں۔۔۔

سپاہی: ''بہت اچھے حضور'' قیدیوں کو اندر کھینچتے ہوئے ''چلو اندر۔۔۔چلو سالو'' ایک سپاہی پیچھے سے دھکیلتا ہے۔

نوشاد علی: (کچھ سوچتے ہوئے) سوجھ گئی۔سوجھ گئی ترکیب کوتوال صاحب!

حشمت خاں: کیا؟ (گرجدار آواز میں)

نوشاد علی: ''چوسر'' (جوے کا اشارہ)

حشمت خاں: ''ٹھیک ہے۔'' سوچتے ہوئے ''تم دانہ پھینکو میں دام بچھاتا ہوں۔''

سین نمبر ۵۴ (مرزا کا گھر)

مرزا صاحب اپنے گھر کے کمرے میں ایک صندوقچے میں کچھ رکھ رہے ہیں۔بیگم کی آواز آتی ہے۔

امراؤ بیگم: مَیں نے کہا جی!

مرزا غالب: (متوجہ ہو کر) آپ کیا کہتی ہیں جی!

امراؤ بیگم: (قریب آ کر) آپ کا بھانجا ہے نا عارف۔۔۔آ رہا ہے۔اسے گود لے لوں۔کسی کو تو بیٹا کہہ کر پکارو گے۔

مرزا غالب: نہ بیگم مجھے ڈر آتا ہے۔۔۔میں نے جس چیز کو اپنی کہا وہی بے گانی ہوئی۔میں نہیں

چاہتا عارف بیٹے پر مصیبت آجائے۔

امراؤ بیگم: ہٹو جی، مت ایسی باتیں زبان پر لاؤ۔

مرزا غالب: ''تو پھر تمہاری مرضی، مجھ سے زیادہ اور کون خوش ہوگا۔ پلا پلایا بیٹا مل جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔'' مسکرا کر'' میں بنا کسی تردّد کے بچّے کا باپ اور دادا بن جاؤں گا اور تم بنا تکلیف کے ماں اور دادی۔۔۔''

امراؤ بیگم: چلو ہٹو۔

مرزا غالب: اچھا بیگم میں اب چلا۔

امراؤ بیگم بہت خوش نظر آتی ہے۔

سین نمبر ۵۵

غالب گھر کے دروازے سے باہر نکل رہے ہیں۔ کلّو میاں کو دیکھتے ہوئے۔

مرزا غالب: ''کلّو''

کلّو: بندہ پرور (اور ہاتھ میں پکڑے پھول پیش کرتا ہے)

مرزا غالب: (نوکر سے پھول لیتے ہوئے) سبحان اللہ سبحان اللہ۔۔۔ کیا پھول ہیں! پھولوں کو سونگھتے ہوئے شعر کہتے ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق، گو، مجھے کافر کہے بغیر

کلّو: (آداب کرتے ہوئے) ''حضور کہاں؟''

مرزا غالب: وہیں، جہاں کب سے جانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ آج ایفائے عہد ادا کرنے کا وقت آگیا ہے کلّو میاں!

اسی اثناء میں نوشاد علی آجاتا ہے۔

نوشاد علی: ہاں مرزا صاحب! وعدہ وفا کرنے کا وقت آگیا؟ گوٹ جوں کی توں پڑی راہ دیکھ رہی ہیں آپ کی۔۔۔ آج بازی ہو جائے مرزا!

مرزا غالب: ''آج نہیں نوشاد علی۔'' اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر'' کیا تم کل تک انتظار نہیں کر سکتے۔''

نوشادعلی: بےادبی معاف مرزا صاحب! کل کس نے دیکھی ہے۔ یہ وعدے کی ہنڈی آج ہی بھگتانی پڑے گی۔

مرزا غالب: اچھا۔۔۔اچھا بھائی (اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے)

سین نمبر ۵۶ (چودھویں بیگم کا بالا خانہ)

چودھویں بیگم باہر کی کھڑکی سے ہٹتے ہوئے اندر ماں کی طرف آتی ہے۔ چہرے پر مایوسیوں کے سائے ہیں۔

چودھویں بیگم: مرزا جی نہیں آئے امّاں!

ملکہ جان: ''آئیں گے بھی نہیں۔'' بیٹھے بیٹھے روکھائی سے ''اب پتہ چلا، ہمیں بھگتا دیا اور نکل گئے۔۔۔گشت لگائی، جاروں اُور کی ہوا کھائی، بدنامی اُٹھائی، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔''

کرچی کرچی وجود لیے چودھویں ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔

چودھویں بیگم: ''نہیں اماں! تُو شاعر کے دل کو نہیں سمجھتی۔ وہ اپنوں کو رُلاتا ہے تاکہ دوسروں کو ہنسائے۔ خود کو جلاتا ہے کہ اوروں کی دنیا جگمگائے۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ آئیں گے۔ایک بار ضرور آئیں گے۔ وہ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔''

اور ماں خالصتاً پیشہ ور نائیکہ کی مانند، بےاعتنائی سے منہ میں رکھی گلوری چباتی رہی۔

سین نمبر ۵۷ (صادق میاں کا جوئے کا اڈہ)

جواری اڈے پر بیٹھے جوا کھیل رہے ہیں۔ اُن میں نوشادعلی اور مرزا غالب بھی ہیں۔

نوشادعلی: ''ہوجائے سوسو کی؟'' (غالب سے مخاطب ہیں)

مرزا غالب: ''سوسو کی نہیں، پچاس پچاس کی۔'' گوٹیاں درست کرتے ہوئے ''تم سمجھتے ہوئے کہ میری جیب خالی ہے، لو اطمینان کرلو۔ وظیفے کے پیسوں کی بو بھی ہے میاں۔۔۔پر سنو! قاعدے سے گوٹ کھیلو، شائستہ کھیل کھیلنا۔۔۔شاعر سے کھیل کھیل رہے ہو۔''

نوشادعلی ہنستا ہے۔

نوشادعلی: ''یہ شائستہ وائستہ کچھ نہیں، گوٹ جب داؤ پر چڑھے گی تو تب لوں گا۔'' کن اکھیوں سے داخلی دروازے کی طرف دیکھ کر''۔۔۔ پھر ہوگی چھکے اور چھکے بارہ''

مرزا غالب: اماں یہ باہر کیا دیکھ رہے ہو؟

ایک شخص سیڑھیوں میں وارد ہوتا ہے اور آہستگی سے کسی کو نیچے جوئے خانہ میں آنے کا اشارہ کرتا ہے۔

نوشادعلی: (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) کچھ نہیں، کچھ نہیں۔

مرزا غالب: اماں ہم تو خود ہی جان دینے بیٹھے ہیں۔

نوشادعلی: یہ چھ اور چھ بارہ (پانسہ پھینکتے ہوئے)

مرزا غالب: یہ قضا سے مشورے کیسے؟ (اپنی باری چل کر)

نوشادعلی: یہ لیجیے پاؤ بارہ

کیمرہ حشمت خاں کو سیڑھیاں اُترتے دکھا رہا ہے جو کوڑا کاندھے پر رکھے سپاہیوں کے ہمقدم آرہا ہے۔

نوشادعلی: پاؤ بارہ نہیں (بظاہر کھیل میں مگن)

حشمت خاں: (وارد ہو کر) آداب عرض ہے مرزا صاحب!

مرزا اُس کی طرف دیکھتے ہیں۔

حشمت خاں: یہ کیا ہو رہا ہے نوشادعلی؟ (کرخت لہجے میں)

نوشادعلی: (دھیرے سے آنکھ دبا کر) ''کچھ نہیں کوتوال صاحب'' اور رقم ٹانگ کے نیچے چھپاتے ہوئے ''چوسر کھیل رہے ہیں۔''

حشمت خاں: ہونہہ۔۔۔اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، جناب مرزا اسداللہ خاں غالب بھی۔'' اور کمر پر ہاتھ رکھے قہقہہ لگا کر ''مگر کاتا گھوڑا سب برابر ہیں۔'' مرزا اور نوشاد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

مرزا غالب: پہلے بات کرنے کی تمیز سیکھو، پھر۔۔۔

نوشادعلی بات قطع کرتے ہوئے۔

نوشادعلی: ''گرمی سے پیش نہ آیئے مرزا صاحب!'' پھر حشمت خاں کی طرف رُخ کر کے ڈرامائی انداز میں ''خاں صاحب! پھر ایسی خطا نہ ہوگی۔''

مرزا غالب: کیسی خطا؟ کون کر رہا ہے؟؟

حشمت خاں: ''آپ'' غصہ میں سپاہیوں کو حکم دیتا ہے۔ ''اُٹھا لو یہ سب سامان۔'' واپس سیڑھیوں

کی جانب پلٹتے ہوئے'' لے چلو مرزا کو بھی۔''

نوشادعلی: معاف کر دیجیے کوتوال صاحب، معاف۔۔۔

مرزاغالب: مَیں سب سمجھتا ہوں، نوشاد تمہارا پرورده ہے حشمت خاں، مگر یہ مت سمجھو تم بچ نکلو گے، ترغیبِ گناہ بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا گناہ۔۔۔

حشمت خاں: گرفتار کر لو، چلو پہنا دو ہتھ کڑیاں اور لے چلو۔

سپاہی آگے آکر ہتھ کڑی پہناتا ہے۔

سین نمبر ۵۸ (دِلّی کے کوچہ و بازار)

بازاروں میں کاروبارِ زندگی کی چہل پہل میں حشمت خاں آگے آگے، اس کے پیچھے مرزا غالب سپاہیوں کے نرغے میں ہتھ کڑی پہنے چلے جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ نوشاد علی بھی۔ دِلّی کی گلیاں اور بازار مرزا کی رسوائی کا منظر دیکھ رہی ہیں۔ ایک موڑ پر ایک شخص پوچھتا ہے۔

کیوں صاحب کیا ہوا؟

حشمت خاں: (کوڑا لہرا کر) ''بھاگ جاؤ''

حشمت خاں بڑی رعونت سے آگے آگے اُن راستوں سے جا رہا ہے جہاں جہاں سے مرزا کی جگ ہنسائی ہو۔ آتے جاتے لوگ فقرے کس رہے ہیں۔ یہی اُس کو مقصود تھا۔ سرِراہ فدن میاں کی بھی نظر پڑتی ہے۔

فدن: ارے مرزا نوشہ میاں؟ (حیرانی سے)

ایک آدمی: نجم الدولہ، دبیر الملک۔۔۔ (طنزیہ فقرہ چست کرتا ہوا)

فدن: مَیں جاؤں (خود کلامی)

اور فدن اپنی مخصوص چال میں تیزی سے موڑ کاٹ جاتا ہے۔ موٹی پان فروش چھبیلی کی دکان پر کچھ گاہک بیٹھے ہیں۔ اُس کی فدن پر نظر پڑتی ہے۔

چھبیلی: فدن میاں! ایک پان نہیں لیتا۔۔۔ (اسے پکارتی ہے)

فدن: (پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے) ارے لعنت بھیجو۔

چھبیلی: (پھر آواز دیتی ہے) ارے فدن میاں پان نہیں کھانا۔

فدن: ارے لعنت بھیجو۔

یہ کہتے ہوئے تیز تیز قدموں سے آگے نکل جاتا ہے۔

سین نمبر ۵۹ (چودھویں بیگم کے بالا خانے کا بیرونی منظر)

فدن جاکر چودھویں کو خبر کرتا ہے۔ چودھویں بیگم بالکونی سے یہ منظر دیکھتی ہے۔

چودھویں بیگم: ''ہائے اللہ مرزا نوشہ'' اور بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترتی ہے اور پکارتی ہے۔
''مرزا صاحب!!!''

دروازے سے باہر آکر چوراہے پر آجاتی ہے جہاں مرزا کو قیدی بنا کر لے جایا جا رہا ہے۔

چودھویں بیگم: ''کیا ہوا مرزا صاحب؟'' پھر حشمت خاں کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر ''چھوڑ دو انہیں، چھوڑ دو انہیں۔''

حشمت خاں: چھوڑ دوں ایک جواری کو، دن دیہاڑے قانون شکنی کرنے والے کو۔۔۔چل ہٹ۔

چودھویں بیگم: ''نہیں نہیں کوتوال صاحب، میں تمہاری منت کرتی ہوں۔'' (دوبارہ ہاتھ پکڑ کر اُس کے پاؤں میں جا بیٹھتی ہے۔)

بڑی اماں ملکہ جان اور فدن بھی پیچھے ہی آجاتے ہیں۔ چودھویں ماں کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھے بیٹھے حشمت خاں سے دہراتی ہے۔ ''پاؤں پڑتی ہوں میں تمہارے۔۔۔''
کیمرہ غالب پر آتا ہے۔

مرزا غالب: تم نے کہا تھا اِک بار میرے گھر آنا، میں آ گیا ہوں۔ (مخاطب چودھویں)
کیمرہ باری باری، چودھویں پر، وہاں سے کوتوال پر، پھر ملکہ جان اور فدن میاں کے کلوز دکھاتا ہے۔

چودھویں بیگم: ''ہائے جی ایسے تو نہ کہا تھا'' حشمت خاں سے پھر التجا کرتے ہوئے ''تم انہیں چھوڑ دو کوتوال صاحب، میرا غصہ ان پر تو نہ نکالو''

حشمت خاں: پرے ہٹ جاؤ، ورنہ تم بھی مداخلت میں دھر لی جاؤ گی۔

چودھویں بیگم: دھرلو، مجھے جو کہنا ہے کہہ لو لیکن انہیں چھوڑ دو، ورنہ مجھے بھی ساتھ لے چلو (ہتھ کڑی پہننے کے لیے بازو آگے کرتے ہوئے)

حشمت خاں اُسے ہاتھوں سے پکڑ کر دھکا دیتا ہے

مرزا غالب: ''حشمت خاں'' (دھاڑتے ہوئے)
سپاہی مرزا کو قابو میں رکھتے ہیں۔
حشمت خاں: ''اس مکان کے نیچے ایک بار دولہابن کے میں آیا تھا'' رُخ بڑی اماں کی طرف اور رعونت سے ''ایک یہ آیا ہے'' غالب کی طرف اشارہ اور حکم دیا ''چلو''
ملکہ جان: (اُسے جاتا دیکھ کر) تم نے میری بیٹی کو مارا ہے۔ پٹے اللہ کی مار، آدم کی پھٹکار ---گولی پڑے، تو سسکتا مرے۔ (بڑی اماں بددعائیں دیتے ہوئے)
چودھویں بیگم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیتی ہے اور رو دیتی ہے۔

سین نمبر ۵۹ (جیل خانہ)

مرزا قید خانے کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔
نہ گُل نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
''واہ'' داد کی آواز (کیمرہ آہستہ آہستہ دور آزردہ پر جاتا ہے۔ ساتھ میں مومن خاں مومن بھی ہیں۔)
آزردہ: واہ مرزا صاحب! شعر کی چاٹ یہاں بھی نہ گئی۔
مومن خاں مومن: چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی --- جی تو نہیں ہار دیا؟
صدرالدین آزردہ ہنستے ہیں۔
مرزا غالب: ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ درپار
سب ہنس پڑتے ہیں۔ کیمرہ دروازے پر عارف کو دکھاتا ہے۔ آزردہ ہاتھ کے اشارے سے اُسے آگے آنے کا کہتے ہیں۔
عارف: (سلاخوں کے پاس غالب کے قریب جا کر جھک کر) آداب عرض ہے خالو جان۔
مرزا غالب: (سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر)
تُو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
زینت سجدۂ جبینِ نیاز

مرزا غالب: کیسے ہو عارف؟
عارف: اچھا ہوں خالو جان۔
مرزا غالب: بہو کیسی ہے اور ننھا؟
عارف: اچھے ہیں، آپ کو سلام بھیجا ہے۔
مرزا غالب: میرا سلام دینا۔۔۔کاش میں خود وہاں ہوتا، پر میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ہوتا بھی تو ہمت ہار کے فارغ۔۔۔(اور دُکھ سے گر جاتے ہیں)
عارف: ہمت نہ ہاریئے خالو جان۔
صدرالدین آزردہ: سب ٹھیک ہو جائے گا مرزا۔۔۔تمہارے چاہنے والوں میں سے ہر کوئی اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہے۔

سین نمبر ۲۰ (شاہی دربار)

شاہی محل میں بادشاہ مسند نشین ہیں۔ حقے کی نے منہ میں، خدام پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ چودھویں بیگم حاضر ہوتی ہے۔ جھکتے ہوئے۔
چودھویں بیگم: عالم پناہ کے حضور بندی آداب بجالاتی ہے۔
بہادر شاہ ظفر: ہم نے پہچانا تم چودھویں بیگم ہو، مرزا کے چاہنے والوں میں سے ایک۔۔۔کیا کہنے آئی ہو؟
چودھویں بیگم: نوازش بے پناہ کا واسطہ دینے آئی ہوں۔۔۔حضورِ اقدس سے انصاف کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ شاہ عالم۔۔۔مرزا نوشہ کو حشمت خاں کوتوال نے ایک بہتان میں پکڑ لیا ہے۔
بہادر شاہ ظفر: ہم جانتے ہیں چودھویں! ہمیں بھی اس بات کا اتنا ہی دُکھ ہے۔ (حقے کی نے دوبارہ پکڑتے ہوئے) جتنا شاید تمہیں۔
چودھویں بیگم: آپ کے ہوتے ہوئے یہ ناانصافی؟ آپ حکم دیجیے عالم پناہ کہ مرزا کو اسی دم رہا کر دیا جائے۔
بہادر شاہ ظفر: کاش یہ ہم کر سکتے۔
چودھویں بیگم: ''عالم پناہ۔۔۔''

بہادر شاہ ظفر: ''ہمارے منہ سے بات سن کر شاید تمہیں حیرت ہو'' اور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ''مگر وقت وقت کی بات ہے۔ نہ صدا آنکھی نہ آنسو ہے (بادشاہ چلتے ہوئے) اور شہنشاہِ ہند کی حکومت جمنا کنارے تک رہ گئی۔۔۔ جس علاقے میں مرزا پکڑے گئے ہیں وہاں ہمارا نہیں فرنگی کا حکم چلتا ہے۔''

(ایک ہاتھ ستون پر سہارے کے لیے رکھا ہے دوسرے میں تسبیح ہے۔)

چودھویں بیگم: تو عالم پناہ، آپ رسید اُن کے نام سفارش کی لکھ دیجیے۔ مجھے یقین ہے شاہی مراسلہ دیکھتے ہی اُس کی گردن اداب سے جھک جائے گی۔

بہادر شاہ ظفر: اچھا تم ایسا سمجھتی ہو تو ہم مراسلہ لکھے دیتے ہیں۔

یہ کہہ کر بادشاہ اندرون محل چلے جاتے ہیں۔

چودھویں بیگم: یا اللہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

(دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر دیکھتی ہے۔ کیمرہ کلوز کرتا ہے)

سین نمبر ۶۱ (فرنگی ریذیڈنٹ)

غالب کی قید پر ساری دِتی سوگوار ہے۔ بادشاہ کا تحریر کردہ مراسلہ فرنگیوں کے پاس جاتا ہے۔

ریذیڈنٹ بہادر: (مراسلہ پڑھنے کے بعد) ہم کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔؟ اب بادشاہ ہم سے سفارش کرنے لگے۔

(ایک کرسی پر صدر الدین آزردہ، اُن کے پیچھے چودھویں اور ایک طرف حشمت خاں بھی کھڑا ہے۔)

حشمت خاں: بادشاہ سلامت ہمارے روزمرہ میں دخل دینے لگے سرکار تو حکومت چل چکی۔

آزردہ: بادشاہ حکومت کی راہ میں روڑے نہیں اٹکا رہے۔ اُن کا فرمان ہے کہ واقعے کی اچھی طرح چھان بین کی جائے۔ مرزا کچھ معمولی آدمی نہیں، دِتی کی۔۔۔

حشمت خاں: (بات قطع کرتے ہوئے) معمولی آدمی ہو یا غیر معمولی۔۔۔ حضور قانون قانون ہے۔

آزردہ: قانون کیا ہے اور کیا نہیں، یہ مجھے آپ سے نہیں سیکھنا ہے کوتوال صاحب! قانون یہ نہیں کہتا کسی کو گناہ کے لیے اکسایا جائے اور پھر دھر لیا جائے۔

حشمت خاں: گستاخی معاف مفتی صاحب! قانون یہ بھی نہیں کہتا کہ گناہ سرزد ہو تو مجرم کو چھوڑ

دیا جائے۔

آزردہ: (کھڑے ہو کر) ''کون مجرم؟ کیسا مجرم۔۔۔ مجرم نوشاد علی ہے۔'' آگے بڑھ کر حشمت کے قریب جا کر ''ہم پوچھتے ہیں نوشاد علی آپ کا بھیجا ہوا آدمی تھا کہ نہیں؟''

حشمت خاں: ''نہیں تھا سرکار (ریذیڈنٹ بہادر کی طرف دیکھ کر) مگر۔۔۔

ریذیڈنٹ بہادر: Keep Quite

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے دونوں طرف دیکھ کر ''کرائم چاہے Instigation سے کیا جائے یا Otherwise (سیٹ سے کھڑے ہو کر) Crime is Crime'' اور حکم دیتا ہے۔ "You may go gentelman" یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔

آزردہ مایوس ہو کر پلٹتے ہیں۔ حشمت خاں موچھ کو مروڑا دیتا ہے۔

چودھویں بیگم: کیا مطلب؟

حشمت خاں: مطلب یہ کہ مرزا کی قید بحال ہے، آپ تشریف لے جایئے۔

چودھویں بیگم: میں تو چلی جاتی ہوں حشمت، مگر اتنا یاد رکھو اِس جھوٹ اور بے ایمانی کے بدلے کتے کی موت مرو گے، مانگے سے پانی نہ ملے گا۔۔۔ پائی پائی کا حساب دو گے خدا کی بارگاہ میں۔ (کٹ)

سین نمبر ۶۲ (درگاہ شریف کا منظر)

اللہ کے برگزیدہ بندے کی درگاہ کے برآمدے میں لوگ بیٹھے ہیں۔ یہاں سے کیمرہ موو کرتا ہے وہاں ایک قوالی پارٹی گا رہی ہے۔

سخی سرکار ہے تیری ، غریبوں کا تو داتا ہے
تیرے در پر جو آتا ہے ، وہ کچھ لے کر ہی جاتا ہے
جو تو چاہے گھر آباد ہو جائے
کوئی مجبور قید کے غم سے آزاد ہو جائے
سجدے میں ہے سر ، تجھ پر ہے نظر
شکوے بھی زباں تک آ پہنچے
دیوانے یہاں تک آ پہنچے

مزار کے حاطہ میں آنے والے زائرین میں چودھویں بھی اندر داخل ہوتی ہے۔ فدن میاں ساتھ ہے۔ چودھویں خواتین میں بیٹھ جاتی ہے۔فدن آگے مردوں کی طرف جاتا ہے۔کیمرہ پھر قوالوں کوفوکس کرتا ہے۔

بھٹکتی پھر رہی تھی آرزو غم کی راہوں میں
یکا یک تیری صورت پھر گئی میری نگاہوں میں
دعاؤں کو وہاں لایا جہاں تاثیر بنتی ہے
سنا ہے تیرے دربار میں تقدیر بنتی ہے
جلتا ہے بدن ، اینٹھتا ہے جگر
کرے اب تو کرم ، لے اب تو خبر
چمن سے نکل کر دیکھ ذرا
پروانے کہاں تک آ پہنچے
دیوانے یہاں تک آ پہنچے

اس پرتکرار،کیمرہ Move کرکے اسی دربار میں چودھویں کے پاس بیٹھی امراؤ بیگم پر جاتا ہے جو دعا مانگ رہی ہے پھر چودھویں بیگم کوکلوز کرتا ہے۔ وہ بھی دعا مانگ رہی ہے۔

امراؤ بیگم: ''یا خواجہ کیا میرے میاں کو وظیفہ اور خطاب اس لیے دیا تھا کہ ان پر عتاب نازل ہو۔اس لیے عزت وتکریم دی تھی کہ وہ جیل کی ہوا کھائیں۔''

اس دعا پر چودھویں بیگم اپنی دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔

چودھویں بیگم: بیگم! آپ کون ہیں؟ آپ کے میاں۔۔۔

امراؤ بیگم: کیا بتاؤں بی بی مرزا غالب۔۔۔

چودھویں بیگم: آہا۔۔۔ غالب (انگلی دانتوں میں لے لیتی ہے)

امراؤ بیگم: کیوں بی بی! کیا تم انہیں جانتی ہو؟

چودھویں بیگم: نہیں سنا ہے بڑے نیک آدمی ہیں بڑے خدا ترس۔۔۔

امراؤ بیگم: وہ خدا ترس کہاں۔۔۔ مگر خدا کو بھی اُن پر ترس نہیں۔

چودھویں بیگم: کیا ہوا؟

امراؤ بیگم: ہونا کیا تھا۔۔۔اچھے بھلے دِن نکل رہے تھے۔ہم دونوں میاں بیوی کے۔بیچ میں ایک ڈوم لڑکی چلی آئی۔اُس نے خانہ برباد کردیا۔گھر ہی اُجاڑ کے رکھ دیا میرا۔

چودھویں بیگم: نہ بسم اللہ۔یہ بھی تو ہوسکتا ہے بیگم!وہ لڑکی بیچاری مصیبت کی ماری جانتی ہی نہ ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے۔محبت اندھی ہوتی ہے۔

امراؤ بیگم: گمر (محبت) راستہ دکھاتی ہے۔وہ خود کو جلاتی ہے،محبوب کو جلاتی ہے۔۔۔۔وہ محبت کہاں کی جو اپنا گھر آباد کرے اور دوسرے کا گھر برباد کر ڈالے۔اُس لڑکی کو سچا پیار ہوتا تو مرزاجی پر آفتوں کا پہاڑ ٹوٹنے سے پہلے ہی ٹل جاتی۔

کیمرہ چودھویں بیگم کو کلوز کرتا ہوا جو دُکھ سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔پھر اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے پس منظر میں قوالی کی آواز۔

سہ وہ بات بھلا کب بگڑے گی
جو بات یہاں تک آ پہنچی

چودھویں بیگم: (دعا کے لیے پھر ہاتھ اُٹھا کر)''میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی اے خواجہ،تُو اپنے کرم کی نیک بخشش اِس بی بی کے دامن میں ڈال دے۔''

منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چکر سا آ جاتا ہے۔امراؤ بیگم دیکھتی ہے،چودھویں بیگم سنبھل کر فدن کی طرف جاتی ہے۔امراؤ بھی پیچھے آتی ہے۔مگر فدن اُسے تھام کر لے چلتا ہے۔(کٹ)

سین نمبر۶۳ (اِن ڈور)

چودھویں اپنے گھر میں برتن وغیرہ رکھتے ہوئے مایوسیوں کی تصویر بنی

چودھویں بیگم: ہاں اماں جان ختم ہو گیا۔ہارگئی میں زندگی کا مقدمہ۔

چودھویں کو چکر آتا ہے۔بڑی اماں بانہوں میں سنبھالتی ہے۔

ملکہ جان: موتی،موتی۔۔۔ارے فدن!سن تو ذرا پانی تو لائیو۔

سین نمبر۶۴ (اِن ڈور)

چودھویں بستر پر لیٹی ہے۔ملازم پاس کھڑے ہیں۔ماں بیمار چودھویں کو دوائی کھلا کر گلاس

پاس کھڑے ملازم کو واپس کرتی ہے۔

چودھویں بیگم: امی! میں نے کیا قصور کیا ہے، ہر چیز مجھے مارنے پہ کیوں تلی ہوئی ہے۔

ملازم چلے جاتے ہیں۔

ملکہ جان: نہیں بیٹا! تجھے وہم ہو گیا ہے۔

چودھویں بیگم: اب میں یہاں نہ رہوں گی۔ دلّی کی ہر چیز مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔۔۔ مجھے یہاں سے لے چلو ۔ میں مرزا کی دلّی میں نہ رہوں گی۔

ملکہ جان: ہائے تجھے کہاں لے چلوں۔

چودھویں بیگم: (ٹوٹے ہوئے لہجے میں) "کہیں بھی لے چلو اماں۔۔۔ اُٹھتے بیٹھتے ہوئے میری مٹی مجھے پکار رہی ہے۔

(بڑی اماں روتے ہوئے اُٹھ جاتی ہے)

کیمرہ اوپر جاتا ہے فانوس ہے اور اُس کے اوپر دیوار پر تختی لگی ہے جس پر

"إن اللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر"

لکھا ہے۔ کیمرہ واپس دھیرے دھیرے بٹی پر آتا ہے۔ لب ہلتے ہیں (پلے بیگ سنگر ثریا)

ؔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ماں سامان سمیٹتے ہوئے دکھائی دے رہی ہے۔ چودھویں کو دیکھ دیکھ کر آنسو پونچھ رہی ہے۔

ؔ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

چودھویں اُٹھ کر نقاہت سے چلتے ہوئے ستون کو ٹیک لگاتی ہے۔

ؔ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ماں ملکہ جان چودھویں کے قریب جاتی ہے اور اُسے لے کر چلتی ہے۔ فدن میاں کمر پر سامان لاد رہے ہیں۔

؎ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ماں بیٹی غمگین نگاہوں سے گھر کے درودیوار کو دیکھتے ہیں۔ ملازم سامان اُٹھائے ہوئے ہیں۔ قدن کے ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔ دہلیز پر چودھویں بالا خانے کو حسرت بھری الوداعی نگاہ سے دیکھتی ہے اور سب گھر سے باہر نکل جاتے ہیں، اجنبی منزلوں کی جانب۔

سین نمبر ۶۵ (جیل خانے کا بیرونی دروازہ)

ایک طرف چوبدار کھڑا ہے۔ سامنے راستے پر لوگ آ جا رہے ہیں۔ آہستگی سے دروازہ کھلتا ہے۔ اندر مرزا دکھائی پڑتے ہیں۔

جیلر: مبارک ہو مرزا صاحب۔۔۔ رہائی مبارک ہو مرزا صاحب۔

مرزا غالب: ''شکریہ۔۔۔ میں آپ کی کیا نذر کروں جیلر صاحب۔'' واسکٹ کی جیب سے کچھ نکال کر'' ہمارے پاس یہی رہ گیا ہے تھوڑا مشک نافہ۔

جیلر: ''ہمارے لیے یہی بہت ہے مرزا صاحب'' عقیدت سے'' اسی مشک نافہ کی طرح ایک دن دنیا جہان میں آپ کی خوشبو پھیل جائے گی۔''

مرزا غالب: ''لو جسے پیار کرتے ہو اُسے دے دینا۔'' جیلر کو تھماتے ہوئے'' یہ تھوڑا سا میں اپنے لیے رکھ لیتا ہوں۔'' اور اُسے جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ باہر نکلتے ہیں جیل کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

سامنے وفادار کلو ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ ساتھ میں برقعہ پوش امراؤ بیگم ہے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے۔

مرزا غالب: ''کلو'' امراؤ بیگم پر نظر جاتی ہے تو منہ سے نکلتا ہے'' بیگم!''

اچانک پس منظر میں چودھویں بیگم نغمہ سرا ہوتی ہے۔ (آواز ثریا)

؎ میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
مجھ سے بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غالب آواز کے سحر میں چل پڑتے ہیں۔ امراؤ بیگم دیکھ رہی ہیں۔

کیمرہ چودھویں بیگم کے بالا خانے کے دروازے کو فوکس کرتا ہے جس پر مرزا دستک دے رہے ہیں۔ پھر کھٹکھٹاتے ہیں۔

مرزا غالب: دروازہ کھولو دلی والو۔۔۔دن دیہاڑے ہی سو گئے۔

کوئی کھولتا ہے۔

ایک شخص: کون ہو بھائی؟

مرزا غالب: میں غالب ہوں۔۔۔چودھویں بیگم سے کہہ دو غالب آیا ہے۔

شخص: وہ اُٹھ گئیں، چلی گئیں یہاں سے۔

مرزا غالب: چلی گئیں؟ کہاں چلی گئیں؟؟

شخص: ''واللہ عالم'' (اور دروازہ بند کر لیتا ہے)

مرزا غالب: ''واللہ عالم؟'' دروازے پر ہاتھ رکھے ہوئے ''کس اللہ کے بندے سے پوچھوں۔

لاٹھی ٹیکنے کی آواز۔۔۔ غالب آواز کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں۔

مرزا غالب: ''حافظ جی! حافظ جی!!'' پاس جا کر پکڑ کر'' حافظ جی! کچھ چودھویں کا پتہ؟''

حافظ جی: مرزا جی جانے کہاں چلی گئی۔۔۔خود تو گئی ساتھ ہم غریبوں کا رزق بھی لے گئی۔

مرزا غالب: یا اللہ۔۔۔اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔

پیچھے ذرا فاصلے پر بیوی امراؤ بیگم اور نوکر کلو کھڑے نظر آتے ہیں۔

حافظ جی: اتنا ہی سنا ہے محرولی کے سرائے سے ایک آواز آتی ہے۔ مگر قریب جائیں تو گم ہو جاتی ہے۔

مرزا غالب: محرولی کے سرائے سے۔۔۔؟

یہ کہہ کر چلتے ہیں۔ پیچھے کھڑی امراؤ بیگم فکر مندی سے نقاب اُٹھاتی ہیں۔ کیمرہ چہرے کا کلوز لیتا ہے۔

سین نمبر ۷۶ (محرولی کے سرائے)

ایک خستہ حال کمرے میں چودھویں بیگم ایک پلنگ پر لیٹی ہے۔ بیمار ہے، ذرا نقاہت سے اُٹھ کر دروازے کے کھلے پٹ دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کیمرہ ایک طرف کھڑے قدن میاں اور ملکہ جان پر جاتا ہے۔

ملکہ جان: ''یارب العالمین، میری بیٹی کو زندگی دے۔'' دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر ''نہیں تو اُٹھا لے اس دنیا سے۔'' (اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دیتی ہے)

قدن میاں: ''حوصلہ کرو بی بی۔''

ملکہ جان: ''کیا حوصلہ کروں۔ دس دن ہو گئے ایسے ہی پڑی ہے میری بیٹی، موت اور زندگی کے بیچ، ایک ٹک دروازے کی طرف دیکھتی جا رہی ہے جیسے۔۔۔ جیسے کوئی آنے والا ہے۔''

ڈھلکے لہجے، ٹوٹی آس اور پژمردہ آواز میں چودھویں غالب کی ایک غزل گاتی ہے۔ (آواز ثریا)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

دوسری جانب مرزا غالب دنیا بھر کی ناکامرانیاں اپنے دجود کے کاندھے پر اُٹھائے، چودھویں کی جستجو میں سرگرداں چلے آ رہے ہیں۔ کیمرہ پھر چودھویں کے نشیمن کا رُخ کرتا ہے۔

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(غالب کو دریا پار جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے)

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

(بڑی اماں ملکہ جان متواتر رو رہی ہیں)

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(مرزا غالب تلاش کرتے کرتے منزل تک آ جاتے ہیں اور دروازے سے پکارتے ہیں)

مرزا غالب: ''چودھویں''۔۔۔ دروازہ کھلتا ہے باہر سے آواز آتی ہے میں آ گیا چودھویں۔۔۔''

چودھویں: ''مرزا جی'' کہہ کر اُٹھتی ہے۔

ملکہ جان: بیٹی۔۔۔ میری بیٹی (ماں سے حالت دیکھی نہیں جاتی اندر چلی جاتی ہے)

مرزا غالب: (جذباتی ہو کر) ''چودھویں، میں آ گیا چودھویں۔'' (گھر میں داخل ہوتے ہیں)
چودھویں وجود میں بچی کچی طاقت مجتمع کر کے یکلخت اُٹھتی ہے اور دروازے میں آ جاتی ہے۔ نگلی محبت پکارتی ہے ''مرزا جی''

مرزا غالب: ''چودھویں میں آ گیا۔''

چودھویں: ''آ گیا میرا نوشہ'' (اور دل ناداں کی وارفتگی پر غالب کے سینے سے سر لگا دیتی ہے)

مرزا غالب: میں آ گیا چودھویں، میں آ گیا چودھویں۔
(ممتا کی ماری کمرے میں داخل ہوتی ہے)

ملکہ جان: ''بیٹی۔۔۔''

مرزا غالب: (چودھویں کو تھامے ہوئے) چودھویں۔۔۔
غالب تشویش سے چودھویں کو دیکھ رہے ہیں اور چودھویں بند پلکیں آہستہ آہستہ کھولتی ہے اور غالب کے چہرے کو ایک ٹک دیکھے جا رہی ہے۔ اُس کی پتلیوں میں اس شاعر نامدار کا چہرہ عکس ریز ہے اور پھر۔۔۔ اُس کا سر ڈھلک جاتا ہے اور مٹھی سے وہ طلائی سکّہ چھوٹ کر فرش پر گر جاتا ہے جو غالب نے پہلی ملاقات میں اُس کی نذر کیا تھا۔

ملکہ جان: ''بیٹی'' زار و قطار روتے ہوئے ''بیٹی۔۔۔''
چودھویں بیگم کا بے جان وجود غالب کی بانہوں میں ہوتا ہے اور پس منظر میں آواز اُبھرتی ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک
(کیمرہ آہستہ آہستہ دونوں کا کلوز لیتا ہے)
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

مرزا غالب: چودھویں۔۔۔ (کرب سے چودھویں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے)

سین نمبر ۶۷ (چودھویں بیگم کے جنازے کا منظر)

چودھویں کا جنازہ جا رہا ہے اور ثریا کی غمگین آواز محو سفر ہے۔

ع حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھوٹا میرے بعد

لوگ میّت کو کاندھا دے رہے ہیں۔ دوسری طرف جنازہ غالب کے کندھے پر ہے ایک شخص غالب کی جگہ لینے کے لیے آتا ہے۔ وہ ہاتھ سے پرے کر دیتے ہیں۔

ع بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

(دوسری جانب کندھا بدلنا چاہتا ہے لیکن غالب کسی کو قریب نہیں آنے دیتے)

سے شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

سین بدلتا ہے۔ قبرستان کا منظر۔

ع غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

جنازہ لحد کے پاس رکھ دیا جاتا ہے۔ غالب افسردہ کھڑے ہیں۔

ع کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

سین نمبر ۶۸ (قبرستان)

مرزا غالب کھڑے ہیں۔ چودھویں بیگم کے جسدِ خاکی کو قبر میں اُتارا جارہا ہے۔ پیچھے سے امراؤ بیگم آتی ہیں، ساتھ میں کلّو بھی ہے۔ قبر پر مٹی ڈالی جارہی ہے امراؤ بیگم بھی مٹی ڈالتی ہیں اور پھول چڑھاتی ہیں پھر دعا مانگتی ہیں۔

ع آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ!

امراؤ بیگم پشت سے غمزدہ غالب کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے۔ غالب پلٹ کر دیکھتے ہیں۔

ع کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

میاں بیوی، مرزا غالب اور امراؤ بیگم دونوں سُست قدموں سے قبرستان سے نکل رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ کیمرہ فیڈ آؤٹ۔

☆☆(اختتام)☆☆

کتابیات

بنیادی مآخذ

سعادت حسن منٹو، ''اوپر نیچے درمیان''، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ:۱۹۵۴ء

سعادت حسن منٹو، ''برقعے''، ظفر برادرز، لاہور:۱۹۵۵ء

سعادت حسن منٹو، ''تلخ ترش اور شیریں'' ادارہ فروغ اُردو، لاہور:۱۹۵۴ء

سعادت حسن منٹو، ''شکاری عورتیں'' ظفر برادرز، لاہور:۱۹۵۶ء

سعادت حسن منٹو، ''منٹو کے ڈرامے''، نیا ادارہ، لاہور:۱۹۴۱ء

سعادت حسن منٹو، ''یزید'' مکتبہ جدید، لاہور:۱۹۵۱ء

ثانوی مآخذ

ابوسعید قریشی، ''فیضانِ فیض''، مکتبہ اسلوب، کراچی، س۔ن

ابوسعید قریشی، ''منٹو'' (سوانح)، ادارہ فروغ اُردو، لاہور:۱۹۵۵ء

احمد ندیم قاسمی (مرتب)، ''منٹو کے خطوط''، پبلشرز کتاب نما، لاہور:۱۹۶۳ء

اقرار حسین شیخ، ''مرزا غالب اسلام آباد میں''، ضیائے ادب، لاہور:۲۰۰۴ء

انتظار حسین، ''علامتوں کا زوال''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور:۱۹۸۳ء

اوپندر ناتھ اشک ''منٹو میرا دشمن'' مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۵۵ء

اے حمید، ''یادوں کے گلاب''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

جگدیش چندر ودھاون، ''منٹو نامہ''، مکر جی نگر (جمنا پار)، دہلی:۱۹۸۹ء

ڈاکٹر برج پریمی، ''منٹو کتھا''، دیپ پبلی کیشنز، جموں (توی)۱۹۹۴ء

ڈاکٹر علی ثناء بخاری (تحقیق)، ''سعادت حسن منٹو''، پبلشرز منٹو اکیڈی گلبرگ، لاہور: مئی ۲۰۰۶ء

ڈاکٹر محمد حسن، ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں''، دارالاشاعت، دہلی:۱۹۸۲ء

ڈاکٹر محمد حسن، ''شناسا چہرے''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ:۱۹۷۹ء

راجندر سنگھ بیدی، ''کلیاتِ بیدی''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور: جولائی ۱۹۸۸ء
زبیر رضوی، ''غالب اور فنونِ لطیفہ''، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی: ۲۰۰۴ء
شمشیر حیدر تجر، نوید الحسن (مرتبین)، ''سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد''، جی سی یونیورسٹی، لاہور: ۲۰۰۵ء
صہبا لکھنوی (مرتب)، ''منٹو ایک کتاب''، مکتبہ افکار، کراچی: ۱۹۹۴ء
محمد حسن عسکری، ''ستارہ یا بادبان''، مکتبہ سات رنگ، کراچی: ۱۹۶۳ء
محمد اسد اللہ، ''منٹو میرا دوست''، منٹو میموریل، لاہور: ۱۹۵۵ء
محمد خالد اختر، ''کھویا ہوا اُفق''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۱۹۸۶ء
ممتاز شیریں، ''منٹو، نوری نہ ناری''، مکتبہ اسلوب، کراچی: ۱۹۸۵ء
میرا جی (مترجم)، ''نگارخانہ'' (نثی مہتم)، امپیریل پرنٹنگ ورکس، لاہور: (طبع دوم) ۱۹۵۵ء
وارث علوی، ''سعادت حسن منٹو، ہندوستانی ادب کے معمار''، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی: ۱۹۹۵ء

رسائل وجرائد

دوماہی ''اُردو ادب'' لاہور: مکتبہ جدید لاہور شمارہ ۱، ۱۹۴۹ء

ہفت روزہ ''آئینہ'' دہلی: ۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء

ماہنامہ ''پگڈنڈی'' امرتسر: منٹو نمبر مارچ اپریل ۱۹۵۵ء

ماہنامہ ''افکار'' کراچی: منٹو نمبر مارچ اپریل ۱۹۵۵ء

ماہنامہ ''گُلِ خنداں'' لاہور: منٹو نمبر شمارہ ۶/۷، ۱۹۵۵ء

ماہنامہ ''نقوش'' لاہور: منٹو نمبر، شمارہ ۴۹۔۵۰، ۱۹۵۵ء

ماہنامہ ''افکار'' کراچی: اپریل ۱۹۵۷ء

ماہنامہ ''جائزہ'' کراچی: مارچ ۱۹۶۰ء

ماہنامہ ''فنون'' لاہور: مئی جون ۱۹۶۷ء

ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور: سالنامہ جنوری ۱۹۷۱ء

ماہنامہ ''قند'' مردان: ممتاز شیریں نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۴ء

ماہنامہ ''شانِ ہند'' دہلی:

ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' راولپنڈی: سالنامہ دسمبر ۱۹۸۴ء

ماہنامہ ''سرگزشت'' کراچی: شمارہ اکتوبر ۱۹۹۴ء

سہ ماہی ''ادبیات'' اسلام آباد: شمارہ ۶۸، ۲۰۰۵ء

اخبارات

کالم: ''روبرو'' (شاہد شیدائی) روزنامہ ''امروز'' لاہور: ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء

کالم: ''غیر سیاسی باتیں'' (عبدالقادر حسن) روزنامہ ایکسپریس، لاہور: ۲۰ جون ۲۰۰۹ء

ooo

Manto, Ghalib Ka Parastar

—Pervaiz Anjum

غالب نے شاعری اور منٹو نے نثر کے موضوعات کے اعتبار سے اردو ادب میں تجربے کیے۔ غالب اور منٹو اپنے اپنے زمانوں میں اپنے اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ متحرک اور بے قرار شخصیتوں کے مالک رہے۔ دونوں کی تخلیقی، تخیلی قوت لاجواب تھی۔۔۔ منٹو اور غالب رند بلانوش تھے۔ دونوں میں اور قدریں بھی مشترک تھیں۔ دونوں نوجوانی میں پتنگ باز تھے۔ غالب اور منٹو قمار بازی کی عادت بھی رہی۔ دونوں اپنے اپنے وقت کی حکومتوں کے عتاب سے بھی برسرِ پیکار رہے۔ غالب نے پنشن اور جوئے کے مقدمات میں خواری اٹھائی اور منٹو نے فحش نگاری کے سلسلے میں کئی بار عدالتی کٹہروں کا سامنا کیا۔ اس طرح دونوں عدالتی تجربوں سے گزرے۔ غالب کو تو رسوائی اور بے عزتی کے احساس نے کچل دیا اور کسی سے سامنا کرنے کی سکت نہ رہی، مگر منٹو کو اس بدنامی نے پذیرائی عطا کردی اور ان کے افسانوں کی شہرت ساتوں افلاک پار کرگئی۔

RS. 300

ISBN 978-969-581-117-7
9 789695 811177

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell 0300-6668284